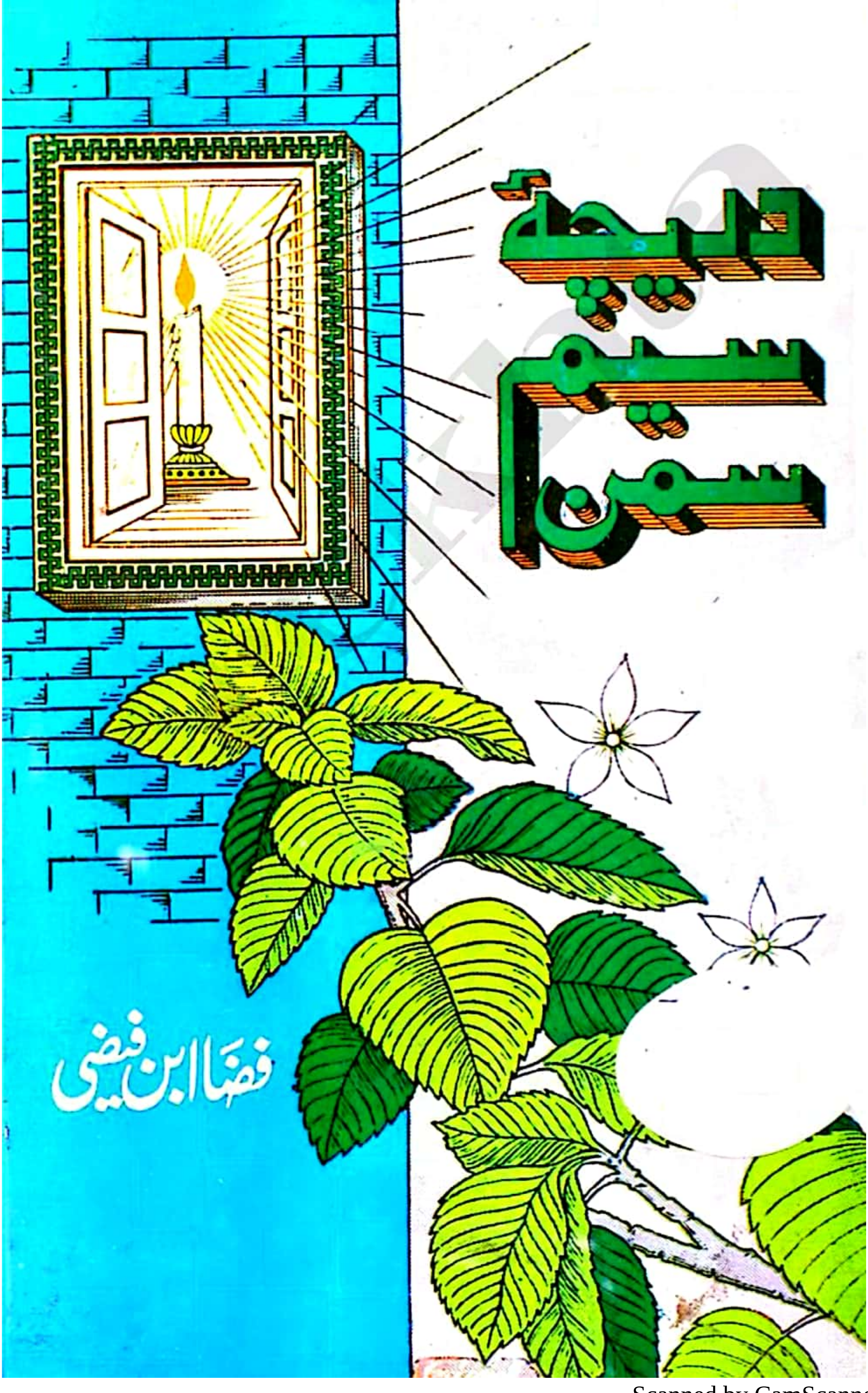

دریچۂ
سیم
سمن
فضا ابن فیضی

فضا ابنِ فیضی

دریچۂ سیم سمن

فیضی پبلیکیشنز ⊛ مئوناتھ بھنجن
۲۷۵۱۰۱ (یو۔پی)

تزئین :. ـــــــــــــــــــ خورشید کمال

مطبع :. ـــــــــــــــــــ ساجدی پریس گورکھپور

قیمت :. ـــــــــــــــــــ ۵۰ روپے

دستیاب

مکتبہ ترجمان، اہلحدیث منزل ۴۱۱۶ اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، علی گڑھ، بمبئی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ ۰ دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

فیضی پبلیکیشنز، مئوناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱ (یو۔پی)

محترم پروفیسر محمود الٰہی کے نام

جن کی شوق انگیز رفاقت اور محبت آمیز سلوک نے حالات و ماحول کی سنگینی و آشو بنا کی ہیں۔ مجھے زندگی کرنے کا وہ امید پرور حوصلہ بخشا، جو میرے لئے اپنے درماندہ قلم کو رواں و تازہ دم رکھنے میں معاون ثابت ہوا

بے ہمدمیِ دل، بہ زبان نالہ بنالد
یک تار چہ سامانِ نوا داشتہ باشد

Scanned by CamScanner

بہار راہ بھٹک جائے گی جلائے رکھ
سرِ دریچہ نسیمِ سمن ابھی مجھ کو

○

دی جو توفیقِ ہنر، حُسنِ پذیرائی بھی دے
اس زیاں خانے میں سودِ نکتہ آرائی بھی دے

ان گنت چہروں کی بڑھتی بھیڑ میں کھو جاؤں گا
خال و خط بخشے، تو اب اپنی سی یکتائی بھی دے

ہوں خود اپنے آپ میں گُم، جیسے جنگل کا گلاب
میں ہوں اک منظر، تو پھر اس کو تماشائی بھی دے

چُپ رہے کب تک، یہ سینوں میں بھرے قرنوں کی آگ
نطق و لب کے پاسباں! پتھر کو گویائی بھی دے

یہ جراحت بے خلش نکلی، تو پھر کیا فائدہ؟
شہرت ایسی دے، کہ جس کی داد رسوائی بھی دے

شوخیِ پائے ہوس پر، شرم آتی ہے مجھے
آگے بڑھنے کی سکت دی تھی، تو پسپائی بھی دے

اک سلیقے سے، ذرا مجھ سے یہ نفرت کر سکیں
جو نہ دی مجھ کو، اب اوروں کو وہ دانائی بھی دے

مدتیں گزریں، نہ اپنے آپ سے مِلنا ہوا
مجھ کو یارب! ان بھرے شہروں میں تنہائی بھی دے

ہو چکے وحشت میں کامل، شہر کے سنجیدہ لوگ
اب در و دیوار کو، صحرا کی پہنائی بھی دے

انگلیاں ہیں، کائنات و ذات کے اوراق پر
دی ہے ہاتھوں میں کتاب ایسی، تو بینائی بھی دے

لفظ تو کیا، خود معانی کے دلوں میں ڈوب جاؤں

مرے ادھورے وجود کا عکس ہیں، یہ پیکر نئے پرانے
نئے پرانے تمام منظر، تمام منظر نئے پرانے

ہر ایک چہرے پہ ثبت ہے، لیکن، اپنا اپنا شناخت نامہ
چلے تو ہیں ساتھ ساتھ، اک دوسرے سے مل کر نئے پرانے

یہ بیچ میں ان کے ہے، جو گہری خلیج، اسے کوئی پاٹ دیتا
رکے ہیں صدیوں سے، ایک محدود فاصلے پر، نئے پرانے

ذرا بھی چوکے، تو پھر نہا جائیں گے خود اپنے لہو میں ہم سب
کہ زد پہ عصری بصیرتوں کے، ہیں اب ہنرور نئے پرانے

نہ خواب دیکھیں، تو رات میں کیسے چاندنی کے یہ چشمے پھوٹیں
ہمارے خوابوں کی ریت میں جذب ہیں، سمندر نئے پرانے

اسی گلی میں پہنچ کے ہم، آج کٹ گئے ایک دوسرے سے
وہی گلی، جس میں آکے ملتے تھے دوست اکثر نئے پرانے

جو اب روایت ہے، عہد میں اپنے، تجربوں کی کلید تھی وہ
الگ کسی سطح پر نہیں، فکر و فن کے محور نئے پرانے

جہاں یہ، دریا پہاڑ کی چوٹیوں سے، وادی میں گر رہا ہے
وہیں پہنچ کر، کھڑے ہیں حیرت زدہ، سخنور نئے پرانے

حصارِ آئینہ سے جو نکلیں، تو خال و خط چھوٹ جائیں پیچھے
ہیں عکس بن کر، بس ایک ہی آئینے کے اندر، نئے پرانے

جدید تر آگہی کے اظہار کے دبستاں میں اے فضا اب
سب اپنے اپنے کو پڑھ رہے ہیں، ورق الٹ کر نئے پرانے

○

میں، اور تیرے درد کا شعلا اور شفق
شام کا جلتا بجھتا چہرا اور شفق

خوابوں کی دہلیز پہ سورج ڈوب گیا
دور تلک، گہرا سناٹا اور شفق

راتیں ہی آئیں، تو سمیٹیں اب مجھ کو
بکھرا بکھرا خوابِ تماشا اور شفق

میں منظر ہوں، میرے پس منظر یہ سب
شمع، شگوفے، چاندنی، دریا اور شفق

ساتھ ہے گویا، اس کی روشن پرچھائیں
درد کا صحرا، گرد کا خیما اور شفق

میں تو خیر، اندھیروں میں ہوں غلطاں سا
لیکن وہ روزن، وہ دریچہ اور شفق

ہیں مجھ کو فانوس میں جراحت، عشق و ہنر
دونوں میرا دُکھ، آئینا اور شفق

لفظ و معانی کے رشتے بھی بے معنی
شیشۂ و تیشہ ٹھہرے، سایا اور شفق

ڈرتا ہوں، سانس لیتے ہوئے، اس خیال سے
یہ سیلِ تند، جسم کی دیوار ڈھا نہ دے

خاکسترِ حیات ہوں، دامن میں باندھ لے
پیارے! تو مجھ کو شعلہ سمجھ کر، ہوا نہ دے

رائگاں سارا سفر، سارے سفر کا ذائقہ
زندگی ٹھہری، غبارِ رہ گزر کا ذائقہ

پھر وہی، سب کی زبانوں پر ہے راتوں کی دُعا
بدمزہ سا کر گیا سب کو، سفر کا ذائقہ

تو ہے، اور اس کی گلی، یہ تجربہ بھی شرط ہے
سنگِ طفلاں کھا، کہ بدلے زخمِ سر کا ذائقہ

کب، دکھوں کی دھوپ میں کوئی جلا میری طرح
سب یہاں رکھتے ہیں ناپختہ ثمر کا ذائقہ

کشتیِ جاں، آس کے چپّو، سرابوں کے بھنور
دے گئے صحرا، سمندر کے سفر کا ذائقہ

پہلے، پتھر کی یہ بارش تھی، نہ موسم کا یہ رنگ
شاخ پہ پھل آئے تو بدلا شجر کا ذائقہ

دور تک، اب اسکی خوشبوئے رفاقت بھی نہیں
کب ہوا تھا اتنا پھیکا، عمر بھر کا ذائقہ

کام اپنا تو جلے جانا ہے، یونہیں صبح تک
ہم سے مت پوچھو! حیاتِ معتبر کا ذائقہ

جذبۂ واحساس میں گھل جائیگی تازہ مٹھاس
چکھ کے دیکھو! کربِ تخلیقِ ہنر کا ذائقہ

خود ہی میں، اپنے قلم کے زہر میں ڈوبا رہوں
تلخ مجھ سے، کیوں ہو، اربابِ ہنر کا ذائقہ

اے فضا! ایجاز ہے سب سے بڑا وصفِ غزل
سو کہانی، ایک حرفِ مختصر کا ذائقہ

○

لفظ محدود، اِنھیں وسعتیں دے گا کتنا
جذبہ، اظہار کے سانچے میں ڈھلے گا کتنا

کس میں ہمت ہے کہ جھانکے پسِ اوراق وسطور
پڑھنے والا بھی مرا، مجھ کو پڑھے گا کتنا

ہے ہنرمند، تو اس نقش کو پانی پہ اُبھار
خود کو، سونے کے ورق پڑ تو لکھے گا کتنا

شہریارو! جو نہیں لائقِ مسند، نہ سہی
یہ مرا جسم، صلیبوں پہ سجے گا کتنا

تیرگی اتنی ہو گہری، تو سجھائی کیا دے
یہ دیا ہے جو بصیرت کا، جلے گا کتنا

اک بکھرنے سے مرے، گرد اُڑے گی کتنی
آسماں اس سے بلند اور اٹھے گا کتنا

عقل ہے موم کی تلوار، کھنچے گی کتنی
وقت کاغذ کا سفینہ ہے، چلے گا کتنا

طرف سے ہے مقابل کوئی جلتا سورج
دھوپ کی زد سے، یہاں سایہ بچے گا کتنا

جاگ کر کاٹ دے باقی ہے جو یہ درد کی رات
تجھ کو اک خوابِ سحر، حوصلہ دے گا کتنا

میری جانب، نہ ستائش بھرے جملے پھینکو
کوئی پھولوں کی یہ بیداد سہے گا کتنا

وہ بھی موسم تھا کہ میں شاخِ نبات ایسا تھا
آج احساس میں یہ زہر گھُلے گا کتنا

دیکھ! چہرے پہ ترے پھیل نہ جائے یہ لہو
ہونٹ ہو جائیں گے زخمی، تو ہنسے گا کتنا

اتنے باذوق تو شاید نہیں گاہک میرے
میں بھی بِک جاؤں، مگر مول لگے گا کتنا

بڑی مشکل ہے، معانی کی امنگوں پہ گرفت
تو مجھے لفظوں کے سینے میں بھرے گا کتنا

حدِ ادراک سے اُس کی، بہت آگے ہوں فضاؔ
صاحبِ فن بھی، مرا جائزہ لے گا کتنا

اچھا دیا، یہ وقت نے صیاد کو سبق
خود نوکِ تیر، جسمِ کماں میں اتر گیا

○

اچھا ہے، بارگاہِ تمنا میں پھینک دو
اس کو بھی میرے کرب کی دنیا میں پھینک دو

ہے کاروبارِ شوق بہت دن سے سرد سرد
تھوڑی سی آگ، کشتِ زلیخا میں پھینک دو

رکھ کر کرو گے کیا، یہ متاعِ زیاں سرشت
ہیں جتنی نیکیاں، انھیں دریا میں پھینک دو

ماحول تپ رہا ہے، تمازت سے وقت کی
کچھ اپنے خواب، دشتِ تماشا میں پھینک دو

اس روشنی میں، جائزہ اپنا بھی لے سکوں
اک شمع، خلوتِ دلِ تنہا میں پھینک دو

یارانِ نجد! ان کی بصیرت ہے خام ابھی
دانش دروں کو کوچۂ لیلا میں پھینک دو

اہلِ نظر کو، جاگتے صدیاں گزر گئیں
خوابوں کی دھول، دیدۂ بینا میں پھینک دو

اب تو گلی گلی، ہُنر آشوب تر ہوئی
تم شہر میں رہو، مجھے صحرا میں پھینک دو

خاکِ شفا ہوں، جانو گے تم میری قدر کیا
اس راکھ کو دیارِ مسیحا میں پھینک دو

O

سب کو، خوابوں کے نہ ایوان میں رکھ
میں حقیقت ہوں مجھے دھیان میں رکھ

راہزن پھرتے ہیں بستی بستی
گھر کا سرمایہ، بیابان میں رکھ

شب پرستوں کی ہے دنیا پیارے
اپنے سورج کو گریبان میں رکھ

فرحت انگیز ہے باہر کی ہوا
کھڑکیاں، ذہن کے ایوان میں رکھ

ہے دروبستِ معانی ان سے
ملکہ، لفظوں کی پہچان میں رکھ

تیرے امروز پہ جو کچھ بیتے
اپنے فردا کو نہ بحران میں رکھ

دیکھ! پھر، لوگ ہیں کتنے باوزن
میں ہوں پتھر، مجھے میزان میں رکھ

کیا کرے گا. تو یہ مٹھی بھر دھوپ
آگ. سینے کے خیابان میں رکھ

عقل و دل میں ہے توازن لازم
یوں نہ جذبات کو، ہیجان میں رکھ

بے صدا، قریۂ احساس ہوا
انگلیاں اب نہ یہاں کان میں رکھ

کسی دستک کا اُجالا نہ سہی
شمع یادوں کی تو دالان میں رکھ

شہر تا شہر ہے زخموں کا پڑاؤ
اپنا خیمہ ابھی میدان میں رکھ

تو ہے غالبؔ کے لئے شیفتہؔ سا
منتخب شعر ہوں، دیوان میں رکھ

اے فضاؔ لَے کا یہ شعلہ نہ بجھے
اتنا آہنگ تو اوزان میں رکھ

هر نفس، سلسلۂ سنگ زنی ہے گویا
زندگی، ٹوٹتے خوابوں سے بنی ہے گویا

تم کہیں سے بھی، اسے چومو، تو نیلے پڑجاؤ
وہ بدن بھی، کوئی ہیرے کی کنی ہے گویا

عکس بھی، ٹوٹ کے بکھرے آخر
ریزہ ریزہ ہوئے چہرے آخر

آگہی میں تھا، کئی صدیوں کی
مجھ کو جُل دے گئے لمحے آخر

کارواں میں تھا کچھ اتنا بکھراؤ
خود ہی گم ہوگئے رستے آخر

آدمی، اپنے ہی خوابوں کی چتا
جل بجھا، جاگتے سوتے آخر

ہم، یہ کس عالمِ برزخ میں ہیں قید
کیا ہوئے جسم کے رشتے آخر

لفظ جامد تھے ، زباں کیا کرتی
چپ رہے بولنے والے آخر

فصل وہ آئی ، کہ آباد ہوئے
کفِ قاتل کے جزیرے آخر

اجنبی لگتا ہے اپنا ہی وجود
کس سے رشتہ کوئی جوڑے آخر

شہد خوابوں کا، ملالے اس میں
گھونٹ جیون کے ہیں کڑوے آخر

گو نہیں وہ مرے احساس کا کیف
بول اُس کے بھی ہیں میٹھے آخر

تو صبا ہے ، تو ملا کر ہم سے
ہم ہیں خوشبو کے ذخیرے آخر

سیکھ! مفہومِ رسالت ہم سے
ہم پہ اترے ہیں صحیفے آخر

نم رہے، جملوں کی تہذیب میں گم
کرگیا چُست وہ فقرے آخر

چہرہ تا چہرہ ہوں، بکھرا ہوا رنگ
مجھ کو اب تو، وہ سمیٹے آخر

لب سے تا نُطق، خموشی کا رچاؤ
اُس سے اب کیا کوئی پوچھے آخر

اے فضا! ذہن و قلم کا یہ بہاؤ
کوئی اب سوچے کہ لکھے آخر

○

میں تو پاگل تھا، مگر مجھ سے سوا تھا وہ بھی
گرتی دیواروں کے سائے میں، کھڑا تھا وہ بھی

سب نے آشوبِ نوا کا، مجھے مجرم لکھا
دیکھتا کون، پسِ حرف و نوا تھا وہ بھی

ذہن کو اس کے ٹٹولا، تو بیاباں نکلا
یوں تو، باہر سے صنوبر سا گھنا تھا وہ بھی

دونو چہرے تھے مماثل، کوئی کس سے ملتا
میری ہی طرح گرفتارِ انا تھا وہ بھی

بے سبب، تلوؤں میں ٹھنڈک سی ہوئی تھی محسوس
کل مری راہ میں، جوں سایہ پڑا تھا وہ بھی

اُس پہ کیا چلتا، مرے حُسنِ بیاں کا جادو
لاتعلق تھا، کہ حرفوں کا بنا تھا وہ بھی

طرزِ پندار نیا، وضع نئی، بات نئی
میرے اُسلوب کے سانچے میں ڈھلا تھا وہ بھی

اس کی شہرت نے نکالا مجھے گُم نامی سے
میں جو خوشبو تھا تو اک موجِ صبا تھا وہ بھی

میں نے جس میں، ترے ملنے کو غنیمت جانا
اک وہ لمحہ، سو مرا دستِ دعا تھا وہ بھی

جب ملا میں، تو بہت زندہ دل اس کو پایا
دیکھنے میں تو بڑا سرد لگا تھا وہ بھی

صاحبِ شعر و بصیرت رہے عریاں پھر بھی
لفظ شرمندہ، کہ معنی کی قبا تھا وہ بھی

ہر تصور کو اُسی عہد میں جا کر دیکھو!
اب جو ہے کُہنہ روایت سا، نیا تھا وہ بھی

اس کی خاطر، مجھے جلنا، کبھی بجھنا ٹھہرا
سربسر، معرکۂ شمع د ہوا تھا وہ بھی

میں ہی کچھ حوصلہ در تھا، کہ سنبھالا اُس کو
ورنہ اندر سے بہت ٹوٹ چکا تھا وہ بھی

اب تو، آنکھوں سے تعلق کی روایت بدلے
جس کو آنسو کہو، زخموں سے رسا تھا وہ بھی

رات، پل بھر نہ رہا نیند کا زانو خالی
پاس ہی میرے کہیں جاگ رہا تھا وہ بھی

ہے گھنا نخل کوئی، جیسے فضا کا لہجہ
فصل نغموں کی جب آئی تھی، اُگا تھا وہ بھی

قدم قدم پہ، مرے عہد کا سفر ہے نیا
نئے ہیں لوگ، نئی سمت، رہ گزر ہے نیا

اب اس کی ضرب سے خود کو بھلا بچائیں کیا
ہر ایک ہاتھ میں اک تیشۂ ہنر ہے نیا

عذابِ وقت کو آؤ! خوش آمدید کہیں
نئی ہے تیغ، نہ قاتل نئے نہ سر ہے نیا

پرانی قدروں کو، اب کس حساب میں رکھوں
تمام سلسلۂ منظر و نظر ہے نیا

گھنی ہو چھاؤں، تو کچھ موسمِ سفر بدلے
ابھی تو، رابطۂ سایۂ و شجر ہے نیا

ہزار وقت نے روکا، مگر قدم نہ رُکے
لہو ہے گرم، تو پھر زورِ بال و پر ہے نیا

سروں پہ دھوپ ہے، قدموں میں آگ کا دریا
مرے لئے، یہ تقاضائے بحر و بر ہے نیا

کچھ اور اس نے، بدن کے خطوط اُبھار دیے
لباس، لفظ و معانی کے جسم پر ہے نیا

کبھی فضا کی، اُجالوں سے رسم و راہ نہ تھی
یہ نام تو، سرِ دیباچۂ سحر ہے، نیا

ایسے جینا، مرے پندار کی رسوائی ہے
کون، شیشے کی طرح، سنگ پناہوں میں رہے

تجھی کو کس لیے صرف انتخاب میں رکھوں
میں اپنا چہرہ بھی، تیری نقاب میں رکھوں

اگر وہ شخص ہے، چبھتے سوال کی صورت
تو کیوں نہ خود کو، میں اُس کے جواب میں رکھوں

حقیقتوں کو، ہے لازم، نگاہ میں رکھنا
کوئی دریچہ بھی دیوارِ خواب میں رکھوں

ذرا بلند ہو، تعلیمِ شوق کا معیار
خود اپنی ذات کو بھی، اب نصاب میں رکھوں

ترے وجود کی خوشبو، جو ہم سفر ٹھہرے
تو میں بھی، پاؤں ہوا کی رکاب میں رکھوں

اُداس لمحوں میں، کچھ زندگی تو آ جائے
ڈبو کے وقت کو، شہد گلاب میں رکھوں

مری تلاش میں ہے. تشنگی کا یہ دریا
نہ روک، پاؤں جو دشتِ سراب میں رکھوں

نہ بھول جائیں کہیں راستا اُجالے بھی
چراغ اک اور، کفِ آفتاب میں رکھوں

تمام عمر جلا، راکھ بھی نہ ہاتھ آئی
اب اس خسارے کو میں کس حساب میں رکھوں

سمندروں کی طرح، بے کراں ہے ہر لمحہ
اسے، میں کیسے، کنارِ حباب میں رکھوں

ترا بدن، کہ ہے اک شوخ و برمحل جملہ
ملے، تو اُس کو بھی اپنی کتاب میں رکھوں

خود اپنی تابشِ جاں کے حصار سے نکلوں
تو ربط تجھ سے، شبِ ماہتاب میں رکھوں

تم آگ ہی سہی، میں ہوں ہوا، اگر چاہوں
تمھیں دھوئیں کی طرح، پیچ و تاب میں رکھوں

فضا یہ ہو مرے بس میں، تو مبتلا تجھ کو
تمام عمر، قلم کے عذاب میں رکھوں

کیسا موجود، اور لا موجود
مختصر یہ کہ ہے خدا موجود

رائگاں، سب کہا سنا اپنا
حرف حرف، اک طلسمِ ناموجود

○

فضول کس لئے، لفظوں کے جال پھیلاؤں
ملے جواب، تو فردِ سوال پھیلاؤں

گرفت میں، نہ ابھی تک وہ روحِ عصر آئی
کچھ اور، دامنِ فکر و خیال پھیلاؤں

زمانہ عمرِ بصیرت کو، رہ گزر بھی دے
جیوں، تو شہرتِ اہلِ کمال پھیلاؤں

ہر ایک ہاتھ میں ہے، احتساب کی تلوار
کہاں، یہ سلسلۂ عرضِ حال پھیلاؤں

ہوں آفتاب، تو ہر شخص کو یہ حسرت ہے
اِسی افق پہ، غبارِ زوال پھیلاؤں

یہ زندگی، کہ ہے لمحوں کا دائرہ۔ اس کو
کہاں کہاں، صفتِ ماہ و سال پھیلاؤں

نجات پاؤں دکھوں سے، تو ایک دن تجھ کو
لبوں پہ اپنے، ہنسی کی مثال پھیلاؤں

یہ میرے دور کے مُنعم، چٹان جیسے ہیں
ہو تیشہ پاس، تو دستِ سوال پھیلاؤں

کسی کو خوش نہیں آتی فضا یہ بیبا کی
جو سچی بات کہوں، سو ملال پھیلاؤں

ہم، گھنے شہروں میں رہ کر بھی، کھلی دھوپ میں ہیں
ٹھنڈے سایوں کا دروبست، شجر سے بھی گیا

○

اور کیا مجھ سے کوئی صاحب نظر لے جائے گا
اپنے چہرے پر، مری گردِ سفر لے جائے گا

دسترس آساں نہیں کچھ، خرمنِ معنی تلک
جو بھی آئے گا، وہ لفظوں کے گہر لے جائے گا

چھاؤں میں نخلِ جنوں کی، آؤ ٹھہرا لیں اسے
کون جلتی دھوپ کو، صحرا سے گھر لے جائے گا

آسماں کی کھوج میں، ہم سے زمیں بھی کھو گئی
کتنی پستی میں، مذاقِ بال و پر لے جائے گا

میں ہی تنہا ہوں یہاں، اس کی صلابت کا گواہ
کون اٹھا کر، یہ مرا سنگِ ہنر لے جائے گا

کاٹ کر دستِ دعا کو میرے، خوش ہو لے، مگر
تو کہاں آخر، یہ شاخِ بے ثمر لے جائے گا

پست رکھّو اپنی آوازوں کو، ورنہ دور تک
بات گھر کی، رخنۂ دیوار و دَر لے جائے گا

میں اٹھاتا ہوں قدم، حالات کی رَو کے خلاف
جانتا ہوں، وقت کا جھونکا کدھر لے جائے گا

اتنی لمبی بھی نہیں لوگو! یہ گمنامی کی عمر
ڈھونڈھ کر مجھ کو، شعورِ معتبر لے جائے گا

کاروبارِ زندگی تنگ ہیں، یہ ہنگامے فضا
کیا وہ سایہ چھوڑ دے گا جو شجر لے جائے گا

○

کوزۂ وقت میں، جوں قلزمِ خوں تھا میں بھی
دعوتِ معرکۂ عقل و جنوں تھا میں بھی

کربلا خیز رہی، خاکِ مشیّت مجھ سے
اُس کی فتراک میں اک صیدِ زبوں تھا میں بھی

وہ روایت تھی، کہ سب نے تجھے قاتل جانا
ورنہ خود محشرِ آشوبِ سکوں تھا میں بھی

مجھ کو یہ فکر، کوئی خواب سہارا تو بنے
اُس کو یہ شکوہ، سرابوں کا فسوں تھا میں بھی

اے فضا شرطِ غزل ٹھہری، اُسی کی آواز
حرف تا حرف، اک آہنگ تو یوں تھا میں بھی

○

کیا ہے وقت نے مجھ سے، معاملہ کیسا ؟
ہر ایک ہاتھ میں ہے سنگِ حادثہ کیسا

متاعِ جسم تو کیا، رختِ جاں بھی ہار آئے
بڑا شعورِ زیاں، تجھ سے واسطہ کیسا

ہر ایک شخص ہے اپنے حدود میں بے فیض
شجر کا، سائے سے ٹوٹا ہے رابطہ کیسا

حقیقتوں کی تلاش و طلب، جنوں ٹھہری
بکھر گیا، مرے خوابوں کا سلسلہ کیسا

مرا وجود ہے، خود ایک دستِ بے تیشہ
طلب کروں کسی پرویز سے، صلہ کیسا

ہو دیکھنا، تو دریچے کو بند ہی رکھو
کھلی ہو آنکھ، تو لطفِ مشاہدہ کیسا

لگی جو آگ، تو پانی کو سب پکار اٹھے
گزر گیا، یہ سمندر پہ سانحہ کیسا

یہ کائنات، کہاں اتنی ریزہ ریزہ تھی
شکستِ ذات نے توڑا ہے حوصلہ کیسا

بصیرتوں کو ہیں، ہر لحظہ امتحاں درپیش
تو چاندنی ہے، تو راتوں سے پھر گلہ کیسا

کھلی کتاب، تو آگے تھا ہفت خواں کا سفر
ورق سے تا بہ ورق ہے، یہ فاصلہ کیسا

ضرور، قتل ہوا ہے کوئی، مرے اندر
زبان پر ہے، لہو کا یہ ذائقہ کیسا

بہارِ آتشِ جاں، راس آ گئی اس کو
ہرا ہرا ہے، دمِ نیم سوختہ کیسا

گری جو برف، تو دریا بہاؤ پر آئے
ترے کرم سے دلوں میں ہے ولولہ کیسا

سوال بس یہ ہے، ترسیلِ جذبہ کیسے ہو؟
غزل کہاں کی، رباعی و ریختہ کیسا

کسی کو صورتِ مفہوم کیا دکھائی دے
اٹا ہے گرد سے، لفظوں کا آئنہ کیسا

اک ایک سانس پہ میں اے فضا سفر میں ہوں
لپٹ گیا مرے قدموں سے مرحلہ کیسا

○

چلو کہ خود نگری کا وہ سلسلہ ٹوٹا
ہوا ہے عکس بھی زخمی، جو آئنہ ٹوٹا

اب اپنی اپنی جگہ، دونوں بے تعلق ہیں
جو مجھ سے تھا اُسے، سارا وہ رابطہ ٹوٹا

کبھی، نہ جادۂ و منزل میں، گرد اتنی تھی
لگے ہے یوں، کسی راہی کا حوصلہ ٹوٹا

میانِ بحر، سنبھلنا تھا کس سے، زور ان کا
کنارے آئیں، تو موجوں کا ولولہ ٹوٹا

یہ کیا ہوا، کہ اچانک بکھر گیا ہر شخص
نہ کوئی حشر ہی اٹھا، نہ حادثہ ٹوٹا

ملا مکاں تو رہائش کو، شہر ہیں اس لے
بہت دنوں پہ، یہ پندارِ فاصلہ ٹوٹا

کچھ اور تھا ہی نہیں ذات و کائنات کے بعد
کسے یہ فکر، کہ زورِ مشاہدہ ٹوٹا

ملاپ روح کا ہے، ریخت و شکستِ بدن
پہنچ کے اپنے ہی مرکز پہ، دائرہ ٹوٹا

ہر استعارہ غلط ہو گیا، ترے آگے
ترا جو ذکر چلا، ہر مبالغہ ٹوٹا

ذرا سی دیر کو، بس اُس کی یاد آئی تھی
خیال میں، کئی رنگوں کا زاویہ ٹوٹا

یہ انقلاب، ہے نقشِ حیات کی تجدید
نہ مرگِ جسم سے، جینے کا ضابطہ ٹوٹا

مرا ادب ہے عبارت، اسی تسلسل سے
نہ تجربوں سے، روایت کا واسطہ ٹوٹا

ہوا کچھ اور بھی نہیں اس کے بعد مستحکم
غرورِ فن، نہ پسِ نقد و جائزہ ٹوٹا

غزل میں، لفظ کو صد گونہ احتیاط سے رکھ
جو ہاتھ بہکے، تو رس کا یہ بلبلہ ٹوٹا

فضا جو اپنی جگہ پر چٹان جیسا تھا
مثالِ یک شجرِ نیم سوختہ ٹوٹا

میں اپنے دور کے ہر تجربے میں زندہ ہوں
مرے شعور کا ماضی ہے حال میں گم سا

آئنے سچے ، نہ چہرے جھوٹے
زاویے، خود ہیں نظر کے، جھوٹے

ہم نے سمجھا انہیں، ایمانِ حیات
عذر، دنیا نے تراشے، جھوٹے

کھوج میں نکلے ہیں، سچائی کی
لے کے سینوں میں، عقیدے جھوٹے

کیا کروں، ذوقِ بصیرت تجھ کو
آنکھیں معصوم ہیں، جلوے جھوٹے

رائگاں، حکمتِ خسرو نہ گئی
سب کے ہاتھوں میں ہیں تیشے جھوٹے

سو بلا ٹال گیا، چپ رہنا
بولنے والے ہی ٹھہرے جھوٹے

مغز کے نام، نہ کچھ پاؤ گے
کھوکھلے ذہن ہیں، جذبے جھوٹے

جاں گسل ہے یہ حقائق کا تضاد
سچے ہاتھوں میں، صحیفے جھوٹے

اب کسی بات میں ابلاغ کہاں
لفظ و معنی کے وسیلے جھوٹے

محتسب کون یہاں ہو کس کا؟
ایک ہی صف میں ہیں سچے جھوٹے

سچ کی تلخی کو بھلانا تھا فضا
لکھ گئے لوگ قصیدے جھوٹے

○

بہت جمود تھا بے حوصلوں میں، کیا کرتا
نہ لگتی آگ تو میں، جنگلوں میں کیا کرتا

اک امتحانِ وفا ہے، یہ عمر بھر کا عذاب
کھڑا نہ رہتا اگر زلزلوں میں، کیا کرتا

ہو چوب گیلی، تو آخر جلائے کون اس کو
میں تجھ کو یاد، بجھے دلوں میں کیا کرتا

مری تمام حرارت، زمیں کا ورثہ ہے
یہ آفتاب، ترے بادلوں میں کیا کرتا

اب اس قدر بھی، طرفدار میں نہیں اُس کا
حمایت اس کی، غلط فیصلوں میں کیا کرتا

یہ لوگ وہ ہیں، جو بے جرم سنگسار ہوئے
حریف، رہ کے ترے منچلوں میں کیا کرتا

میں اُس کے چہرے کی رنگت نہیں، جو اُڑ نہ سکوں
سمیٹ کر وہ مجھے آنچلوں میں کیا کرتا

ادب سے رابطہ دانش کا جانتا ہی نہیں
اُلجھ کے وہ بھی مرے مسئلوں میں کیا کرتا

نہ راس آئی کبھی مجھ کو بزمِ کم نظراں
فضا بھی بیٹھ کے ان پاگلوں میں کیا کرتا

بے نوا لفظوں سے، کوئی ان کا دکھ کیا پوچھتا
جس نے لب کھولے، صداؤں کے بھنور میں کھوگیا

○

یہ دمکتا ہوا آہنگ، نکھرتی آواز
میں ترے دور کی ہوں، ایک اُبھرتی آواز

دیکھنا، دیدۂ بینا، یہ تماشا بھی ذرا
گرد بن کر، مرے چہرے پہ بکھرتی آواز

لے اُڑی لفظ بنا کر، اسے مفہوم کی پیاس
کیا، سلگتے ہوئے ہونٹوں پہ ٹھہرتی آواز

طنز بن جاتی ہے، شاعر کی نوا میں ڈھل کر
سر جھکا کر، بھرے شہروں سے گزرتی آواز

دل کو خوں کیجئے، دیباچہ غزل کا لکھیے
شعلہ شعلہ ہوئی، وہ پھول کترتی آواز

زندگی کی ہے بشارت، اسی مٹی کی کھنک
عرش و افلاک خموشی، مری دھرتی آواز

صاف کانوں سے سنی ہیں نے، دمِ فکرِ سخن
چاندنی رات کے زینے سے اترتی آواز

نئے لہجوں کو، کوئی آئینہ خانہ نہ ملا
کھردری سطحوں پہ گیا رہ کے، سنورتی آواز

کیسے شاعر ترے، نغموں کے مسیحا بنتے
روح پیکر میں جو لفظوں کے نہ بھرتی آواز

نہ رکھو، جسم کے زنداں میں اس کو
لہو ہے روشنی کا نام لوگو!

ہزاروں کشمکش و پیچ و تاب سے چھوٹا
جو اپنے آپ سے چھوٹا، عذاب سے چھوٹا

مرے وجود پہ مرکوز ہے نظر سب کی
مطالعے کا نہ رشتہ، کتاب سے چھوٹا

جسے خلاصۂ مقصود و ماجرا کہیئے
سوال کا وہی پہلو، جواب سے چھوٹا

ہمیں تو یاد نہیں، اُس کے گھر کا رستا بھی
وہ حیلہ، ہم نفسانِ شباب سے چھوٹا

یہ ساری شوخیِ ماحول، بجھ سی جائے گی
جو ہیں، تری نگہِ انتخاب سے چھوٹا

شکستنی سہی، یہ آئنہ، مگر پھر بھی
حقیقتوں کا تعلق، نہ خواب سے چھوٹا

یہ چہرہ چہرہ، اُداسی کا سایہ کیسا ہے؟
وہ روشنی کا نگر، آفتاب سے چھوٹا

بہت عمیق تھے، گو اُس کے جسم کے اسرار
نہ کوئی گوشہ، مرے اکتساب سے چھوٹا

تری تلاش نے، سحرائے جاں میں روک لیا
میں جسم جسم بکھرتے سراب سے، چھوٹا

فضا نصیب ہے اپنا، سفر مدام سفر
کبھی نہ پاؤں، جنوں کی رکاب سے چھوٹا

ہ گزر ہیں، نہ غباروں کی ردا میں گم تھی
میری منزل، مرے نقشِ کفِ پا میں گم تھی

کیا خبر اس کو، کہ دل اس میں ہوا خوں کتنا
آگہی، لذتِ تخلیقِ نوا میں گم تھی

جھیلتا کون، یہ بیداریِ احساس کا کرب
انجمن ساری، تو خوابوں کی فضا میں گم تھی

بولتا کون، کہ تھے سب ہی طرفدار اُس کے
ہر زباں، مصلحتِ بے سروپا میں گم تھی

بات یہ تھی، کہ کچھ اپنی بھی تھی شہرت اس میں
بوئے گل، تربیتِ ذوقِ صبا میں گم تھی

دے گئے جُل مجھے، یارانِ سیاست مشرب
سادہ لوحی مری، تہذیبِ وفا میں گم تھی

ہم بھی آشوب پسند ایسے، کہ جی بھر کے جیے
زیست ہر چند کہ آشوبِ فنا میں گم تھی

کوئی پڑھ ہی نہ سکا، دل کے لہو کا مضمون
ہر نظر، شوخیِ تحریرِ حنا میں گم تھی

لوگ، وہ گرمیِ تاثیر کہاں چھوڑ آئے؟
بات ہونٹوں سے جو نکلی، تو ہوا میں گم تھی

منفرد سب سے تھی، ہر چند کہ میری آواز
سب کی آواز، اسی ایک صدا میں گم تھی

میں جو ٹوٹا، تو فضا وہ بھی سلامت نہ بچا
اُس کے پندار کی لے، میرے انا میں گم تھی

○

چٹان میں تھا، ہواؤں سے ڈر گیا کیسے
بدن، غبار کی صورت بکھر گیا کیسے

یہ بات میرے سوا اور کوئی سمجھے کیا
قلم کا زہر، لہو میں اُتر گیا کیسے

کل اُس سے مل کے، میں آتش بجاں ہوا کتنا
وہ خود تو پھول تھا، شعلے کتر گیا کیسے

ابھی کھڑے ہیں کناروں پہ ڈوبنے والے
میں سوچتا ہوں کہ طوفاں گزر گیا کیسے

مرا وجود، تو اک منضبط اکائی ہے
وہ مجھ کو، سانسوں میں تقسیم کر گیا کیسے

بہ کارِ خویش، بہت ہوشیار تھے ہم لوگ
ہماری آنکھوں میں، وہ دھول بھر گیا کیسے

یہ ذائقہ، نہ کبھی میں نے عمر بھر چکھا
وہ مجھ پہ، زیست کا الزام دھر گیا کیسے

ہزاروں چاند، مری راہ روکنے نکلے
بتاؤں کیا، کہ میں رات اُس کے گھر گیا کیسے

ہمیں تھے، جس نے اُسے قطرہ قطرہ پی ڈالا
نہ پوچھ! وقت کا دریا اُتر گیا کیسے

ہماری موت پہ، سب کو فضا تعجب ہے
بغیرِ تیشہ، یہ فرہاد مر گیا کیسے

○

نہیں یہ بس میں کہ اپنا بدن اُڑھاؤں اُسے
وہ جانِ جاں سہی، آخر کہاں چھپاؤں اُسے

مرا اُچھالا ہوا سنگ، خود مجھی پہ گرا
بہت دنوں سے یہ خواہش تھی، آزماؤں اُسے

چلا ہے کس کا، سمندر کی موج پر قابو
نہیں وہ ریت، کہ جا کر سمیٹ لاؤں اُسے

کبھی نہ ٹوٹے، مرے حافظے پہ قہر ایسا
کہ خود کو یاد رکھوں، اور بھول جاؤں اُسے

دریچۂ نسیمِ سمن

ہر ایسا عزم، اُسے دیکھتے ہی ٹوٹ گیا
یہ آرزو دکھنی، کہ میں بھی، کبھی ستاؤں اُسے

شمیم و نشّہ سے بھی ہے لطیف تر جسم اُس کا
اگر ملے بھی، تو کیسے گلے لگاؤں اُسے

رُکی ہے نازنیں پلکوں پہ، رات بھر کی جگار
سحر بھی ہو چلی، اب اور کیا جگاؤں اُسے

کوئی اٹھا دے، بیاباں میں اب ذرا دیوار
یہ سوچتا ہوں، کسی روز گھر بلاؤں اُسے

مشاہدے کا یہ فن، صرف میرا حصّہ ہے
نظر اٹھاؤں، تو چہرہ بہ چہرہ پاؤں اُسے

ہوا کا جسم ملا ہے، نگارِ معنی کو
قبائے لفظ و بیاں، کس طرح پنھاؤں اُسے

زمیں، جو میرے تفکر کی آنچ سہہ جائے
تو روپ دے کے نیا، آسماں بناؤں اُسے

بھٹک رہا ہے اندھیرے میں، وقت، صدیوں سے
کوئی چراغ تو ڈھونڈھو کہ میں جلاؤں اُسے

بہ قدرِ ذوق نہیں، آگہی کا صحرا بھی
یہی کروں، کسی دریا میں پھینک آؤں اُسے

نہیں پسند اُسے، یہ علامتی اسلوب
کوئی غزل کہوں سادہ تو پھر سناؤں اُسے

حنائے فکر و نظر ہے فضا قلم کا لہو
بنا کے غازہ، کسی رُخ پہ کیا سجاؤں اُسے

○

سب غرورِ سطوتِ دیوار و در مٹ جائے گا
سیل آئے گا، تو بالو کا یہ گھر مٹ جائے گا

شام ہوتے ہوتے، رنگت ساری سنولا جائے گی
دھوپ اُتر جائے گی، پندارِ سحر مٹ جائے گا

کس قدر ہے دوستو! حالات کی رفتار تیز
ایک اک کر کے، نشانِ رہ گزر مٹ جائے گا

ہیں مرے یارانِ بے شیوہ، مثالِ لوحِ آب
ان پہ تم لکھو گے جو نقشِ ہنر مٹ جائے گا

بھرلے اُس کے خواب آنکھوں میں، جب آتے دکھ کی رات
دل سے تیرے، جاگتے رہنے کا ڈر مٹ جائے گا

اک تھکن سی ہے، جو یہ احساس ہیں ڈھل جائے گی
یہ جو رُخ پر ہے غبارِ بے سفر، مٹ جائے گا

اتنے دل برداشتہ کیوں ہو، رفیقانِ جنوں
رنج سارا، اُس کی صورت دیکھ کر مٹ جائے گا

کس قدر مجہول نکلے، آج کل کے آدمی
کیا خبر تھی، امتیازِ خیر و شر مٹ جائے گا

حکمت و شعر و یقین و علم کا اثبات ہوں
میں نہ لب کھولوں تو حرفِ معتبر مٹ جائے گا

اپنے خامے کی روانی پر نہ اتراؤ فضا
یہ سمندر بھی بکھر کر ریت پر، مٹ جائے گا

○

چھپی ہوئی کوئی حکمت ضرور ہے مجھ میں
ترا یہ داعیہ سچ ہے، فتور ہے مجھ میں

ہوں بے ضرر سا، مگر پھر بھی اک تنہا [میت] ہوں
یہ کیسی شورشِ صبحِ نشور ہے مجھ میں

ملیں جو دونوں، توازن کی قدر بن جائیں
سرور تجھ میں ہے، لیکن شعور ہے مجھ میں

بس اتنی بات ہے، سنجیدگی کا پیکر ہوں
تجھے یہ وہم، کہ وضعِ غرور ہے مجھ میں

چراغ، دن کے اُجالے میں کیا جلائے کوئی
ہوں شب نورد کہ شمعوں کا نور ہے مجھ میں

جو تجھ کو دیکھنا چاہے، اُسے، دکھا مجھ کو
کہ نیرِ غیب، برنگِ ظہور ہے مجھ میں

اُسی کے ساتھ کہیں میں نہ خود بکھر جاؤں
وہ کون ہے کہ جو یوں چور چور ہے مجھ میں

مجھے نچوڑ کے دیکھو، مثالِ خوشہ ہوں
لہو نہیں، یہ شرابِ طہور ہے مجھ میں

تمام پرتوِ حور و قصور تجھ سے ہے
تمام حاصلِ حور و قصور ہے مجھ میں

صحیفے طاق پہ رکھ دے، مرا مطالعہ کر
کہ نیرا حاصلِ بین السطور ہے مجھ میں

فضا کے دم سے، عبارت ہے یہ نشاطِ غزل
وہ بن کے، جذبۂ دل کا دفور ہے مجھ میں

مرے جذبے جیسا شگفتہ ہے، مری فکر جیسا اَدق ہے وہ
رہی برسوں زیرِ مطالعہ وہ کتاب جس کا ورق ہے وہ

وہی شعر و فن کی بلاغتیں، وہی جدّتیں، وہی نُدرتیں
کبھی پڑھ کے دیکھ اُسے غور سے، مری آگہی کا سبق ہے وہ

یہ ہے اور بات کہ اُس میں بھی، وہی سوز ہے، وہی تازگی
نہ مرے قلم کا لہو ہے وہ، نہ تری جبیں کا عرق ہے وہ

جو دکھوں کی بھوک ہے عشق میں، وہ ابھی کہاں مٹی دوستو!
یہ جو کچھ ہے خوانِ حیات پر، سو بہ قدرِ سدِ رمق ہے وہ

عجب اک تضاد کی انجمن ہے، ترے فضا کا وجود بھی
کہ سلگتی شام کے موڑ پر کوئی لہلہاتی شفق ہے وہ

○

سحر طلوع ہوئی ، انتظار ختم ہوا
چلو، کہ معرکۂ کارزار ختم ہوا

پکارتے ہی رہے مجھ کو آئنہ خانے
مرا سفر، سرِ دشتِ غبار ختم ہوا

جدید فکر میں ہے، ذائقہ لہو جیسا
گلاب و شہد کا، وہ کاروبار ختم ہوا

خیال و ذہن پہ چھایا ہوا ہے سناٹا
تمام، لفظ و صدا کا حصار ختم ہوا

دبے ہوئے ہیں جو کچھ تیر چٹکیوں میں تو کیا
کمان ٹوٹ گئی، اختیار ختم ہوا

ہر ایک شخص ہے صدیوں کی دھوپ اوڑھے ہوئے
جو لمحہ تھا، شجرِ سایہ دار ختم ہوا

برہنہ سر ہیں مرے دَور کے تمام اقدار
تصورِ کُلہِ شہریار ختم ہوا

نئی حیات کے آتش کدے سجائے کون؟
جنوں کا شعلۂ سرمایہ دار ختم ہوا

ورق ورق کو، بناؤں بساطِ گل کیسے؟
جو حرف حرف تھا رقصِ بہار ختم ہوا

بھرا ہوں پلکوں پہ لے کر کہاں کہاں آنسو
شعورِ درد! ترا اعتبار ختم ہوا

لگی تھی آنکھ کہ خوابوں نے ڈس لیا مجھ کو
کہاں فسونِ شبِ خوش کنار ختم ہوا

مجھی کو ہر کرمِ رائگاں نے دی آواز
مجھی پہ ہر ستمِ روزگار ختم ہوا

قلم کو لوگ متاعِ زیاں سمجھنے لگے
ہمارے بعد، ہنر کا وقار ختم ہوا

کسی طرح سہی، دورِ فضا میں ٹوٹا تو
وہ اک طلسم کہ اردو سے پیار ختم ہوا

مجھ سے ملنا ہو تو، پھر میری کتابیں دیکھنا
ہر ورق پر، عکس اپنا چھوڑ کر جاؤں گا میں

چلتے پھرتے پاؤں ہیں، لفظوں نے بیڑی ڈال دی
اب کہاں، دہلیزِ معنی چھوڑ کر جاؤں گا میں

○

اُس کو، چراغِ آخرِ شب کا سلام لکھ!
یعنی ابھی ہے حرفِ سحر ناتمام۔ لکھ!

منزل نہیں، شکستہ دلی کے سوا کچھ اور
ہوجائیں پاؤں شل، تو سفر کو قیام لکھ

شاید صبا اسی سے، بصیرت کا درس لے
اوراقِ گل پہ نکہتِ گل کا پیام لکھ

ہے جنبشِ نفس بھی، سفر کا معاملہ
تو اب اسے بھی، شوخیِ پائے خرام لکھ

ہم سے فقیرِ راہ بھی جس کو سمجھ سکیں
ایسا بھی کوئی جملۂ سرِ سقف و بام لکھ

اُس کے اسیر میری طرح راستے بھی ہیں
نقشِ قدم کو، حلقۂ زنجیر و دام لکھ

سنتا ہے کون، خاصۂ خاصانِ فن کی بات
لکھنا ہے جو تجھے، بہ زبانِ عوام لکھ

ہر تجربہ ہے اپنی روایت کی بازیافت
ہے باشعور، تو نہ کوئی حرفِ خام لکھ

اُن کے نگاہدار، یہی ہوں گے میرے بعد
تو میرے خواب بھی نئی نسلوں کے نام لکھ

غالبؔ کے فکر و فن کا وہ اسلوبِ دلنواز
اُس کو فضا جدید غزل کا امام لکھ

حیراں ہے وہ، یہ دولتیں کیوں کر سمیٹیے
خوں تھوکیے تو لالہ و گوہر سمیٹیے

اس راکھ میں ہیں پھول بھی، چنگاریاں بھی ہیں
الفاظ کے ذخیرے، سنبھل کر سمیٹیے

کچھ دیکھنے سے پہلے، چکانا پڑا حساب
نظروں کو جب بکھیریے، منظر سمیٹیے

اک اک قدم پہ ساتھ ہے رسوائیوں کا خوف
آندھی ہے تیز، جسم کی چادر سمیٹیے

وہ آسماں بھی، مٹی کے ذرّوں میں بٹ گیا
خود کو اس انتشار میں، کیوں کر سمیٹیے

حیراں سے ہم کھڑے ہیں سرابوں کے درمیان
صحرا بٹورییے، کہ سمندر سمیٹیے

ہر شے، بہ رنگِ خویش ہے، دامن کشِ طلب
کیا کیا، دل و نگاہ کے اندر، سمیٹیے

بے فیضیِ سیاست و دانش کو، کیا کہوں
قُلزم کھنگالیے بھی تو کنکر سمیٹیے

یوں لکھیے اپنے عہد کی راتوں کا مرثیہ
خوابوں کے ٹوٹے بکھرے سے، پیکر سمیٹیے

ہیں تو لہو لہان بھی ہو کر، وہیں پہ ہوں
اب آپ اپنے طنز کے پتھر سمیٹیے

دل ہو اُداس بھی، تو رہے رُخ پہ تازگی
تہ کا کُل اضطراب، نہ اندر سمیٹیے

اک سودِ رائگاں ہے، ہنر کا یہ کاروبار
جب آئنوں کو توڑیے، جوہر سمیٹیے

تاچند، یہ قدیم مضامیں کی بازیافت
مُہرے نئے، بساطِ سخن پر سمیٹیے

کچھ غور کیجیے، اُس کے بدن کے نکات پر
اب تو فضا یہ غزلوں کے دفتر سمیٹیے

اپنے آنسو، خود ہی ہم نے پونچھ لیے
دور، افق پر، ایک ستارا ڈوب گیا

سناٹا، بیخواب ستارے، لمبی رات
کن جھیلوں میں، چاند اکیلا ڈوب گیا

○

بہار میں نہیں، پھر بھی خزاں کی زد میں ہوں
کوئی بتائے، یہ کس امتحان کی زد میں ہوں

نہ جل اٹھوں کہیں، پورے وجود سے اک روز
کہ میں، خود اپنے شعورِ تپاں کی زد میں ہوں

مجھے عزیز ہے، سب کو سمیٹ کر چلنا
غلط، کہ گردشِ پسِ کارواں کی زد میں ہوں

جنوں کے معرکو! کچھ اور انتظار کرو
ابھی تو دانشِ عصرِ رواں کی زد میں ہوں

کھڑا ہوں، اپنی زمیں پر قدم جمائے ہوئے
نہیں یہ فکر، کسی آسماں کی زد میں ہوں

نہیں ہوں سنگ کہ ہو جاؤں ریزہ ریزہ تمام
ہزار تیشۂ سود و زیاں کی زد میں ہوں

کھلا بھی رکھو جو دروازہ، کون آئے گا
کہ میں ابھی سفرِ رائگاں کی زد میں ہوں

عجیب شخص ہوں مقتول بھی ہوں قاتل بھی
کہ اپنے دشنہ و تیر و کماں کی زد میں ہوں

کوئی تو مجھ کو، اب اس قید سے چھڑا لے جائے
میں کتنی صدیوں سے لفظ و بیاں کی زد میں ہوں

غزل طرازو! ابھی مجھ کو زیرِ لب رکھو
نوائے وقت ہوں، لیکن فغاں کی زد میں ہوں

کہاں سجاؤں فضا اب دکانِ شیشۂ و گل
یہاں سیاستِ آہنگراں کی زد میں ہوں

میرے سینے سے گزر جا تو بھی
نفسِ درد، بکھر جا تو بھی

اے مری پیاس کے تپتے صحرا!
دجلۂ خوں میں اتر جا تو بھی

ابھی آنکھوں میں ہے کچھ خواب کی گرد
اِسی پردے میں سنور جا تو بھی

زندگی، غسلِ تمازت ہی سہی
دُھل کے بارش میں، نِکھر جا تو بھی

لے، یہ گوشہ بھی ہوا شہر آشوب
اُٹھ کے اب دشت سے گھر جا تو بھی

اِک حقیقت ہی سہی، میرا وجود
اس حقیقت سے مکر جا تو بھی

فکرِ ترسیلِ معانی کس کو ؟
تہمت الفاظ پہ، دھر جا تو بھی

ہم اکیلے ہی اٹھالیں گے، یہ بوجھ
اے دلِ خاک بسر! جا تو بھی

ہوں سمندر میں، جزیرے کی طرح
پاؤں رکھ مجھ پہ، اُبھر جا تو بھی

وقت کی دہلیز سے، آواز دے لینا مجھے
منجمد لمحوں کو، شعلے کی لپک دے جاؤں گا

○

کمزور بلبلہ نہ تھا، اُٹھا، سمٹ گیا
جس رُخ مڑا ہیں، وقت کا دھارا سمٹ گیا

اب تو، خود ایک نقطۂ موہوم ہے وہ شخص
جس نے مجھے بکھیرنا چاہا، سمٹ گیا

یوں بحثِ ہست و بود تو، پیچیدہ تھی بہت
دو سانس میں، معاملہ سارا، سمٹ گیا

تھا اُس کو، وجہِ کاہشِ جاں، خوشبوؤں کا ورد
کیسا، نسیمِ صبح کا جھونکا، سمٹ گیا

آتے ہی اس کا دھیان، گئی فکرِ روزگار
آنگن میں دھوپ اُتری، تو سایا سمٹ گیا

بچھڑا وہ کیا۔ کہ ولولے سب دل کے بجھ گئے
لَو تھا جو شمع کی، وہی شعلا سمٹ گیا

ملتی کہاں اب اتنی کشادہ فضا اُسے
آکر مرے وجود میں صحرا سمٹ گیا

ہے کائنات، عکس ہماری ہی ذات کا
جس نے بھی اس کے خول کو توڑا سمٹ گیا

ویسے تو میں بھی، کوئی ہمسر نہ تھا، مگر
رکھا جو بڑھ کے پاؤں، تو دریا سمٹ گیا

ہاتھوں میں وقت کے، ہوں میں اسفنج کی طرح
لوگوں نے مجھ کو جتنا سمیٹا، سمٹ گیا

اتنا بھی اب، نہ اپنے فضا کو حقیر جان
ٹھہرا صدی کا رُوپ، جو لمحا سمٹ گیا

○

نفس کو نطق، نگہ کو زبان کر آئے
ہم اُس سے، اپنی تمنا بیان کر آئے

کہیں، نہ اپنا پریشان قافلہ ٹھہرا
غبارِ راہ کی صورت، اُڑان کر آئے

کچھ اس قدر ہے وہ تہ دار، اس سے مل کر ہم
خود اپنے آپ کا بھی امتحان کر آئے

کبھی تو کوئی مسافر، ادھر سے گزرے گا
ملی جو دھوپ، اُسے سائبان کر آئے

خدا کا شکر، کہ چہرے پہ گرد ہے نہ تھکن
کہاں کہاں کی، نہ ہم خاک چھان کر آئے

ہمیں سے مانگے ہے اپنی بلندیوں کا خراج
تری زمیں، جسے ہم آسمان کر آئے

تمام عُمر کٹی، حرفِ دلبراں لکھتے
ہم ایسے لوگ، تجھے داستان کر آئے

ہمارے بعد، سرابوں کا دَور ختم ہوا
جو وہم تھا، اُسے پختہ گُمان کر آئے

وجود اپنا ہے، خالی مکان کی صورت
نثار اُس پہ، تمام آن بان کر آئے

قبولِ عام کی آخر سند اُسی کو ملی
جو فیصلہ، مرے نامہربان کر آئے

یہی کہو گے، فضاؔ سے اگر ملو گے کبھی
کہ ہم بھی سیرِ زمان و مکان کر آئے

ہمیں سے مانگے ہے اپنی بلندیوں کا خراج
تری زمیں، جسے ہم آسمان کر آئے

تمام عُمر کٹی، حرفِ دلبراں لکھتے
ہم ایسے لوگ، تجھے داستان کر آئے

ہمارے بعد، سرابوں کا دَور ختم ہوا
جو وہم تھا، اُسے پختہ گُمان کر آئے

وجود اپنا ہے، خالی مکان کی صورت
نثار اُس پہ، تمام آن بان کر آئے

قبولِ عام کی آخر سند اُسی کو ملی
جو فیصلہ، مرے نامہربان کر آئے

یہی کہو گے، فضا سے اگر ملو گے کبھی
کہ ہم بھی سیرِ زمان و مکان کر آئے

○

آشوبِ روزگار کے تیشے سے کٹ گیا
وہ شخص تھا چٹان سا. ریزوں میں بٹ گیا

انساں زمیں پہ تھا، تو بہت سربلند تھا
پہنچا یہ آسماں پہ، تو قد اور گھٹ گیا

کیا کیا تھا اپنی صاعقہ پائی پہ اُس کو ناز
جھپکی تھی آنکھ، اور زمانہ پلٹ گیا

لادو! خرید کر مجھے آئینہ دوسرا
چہرہ تمام، گردِ تماشا سے اَٹ گیا

قاتل تھی کتنی، اُس کی ادائے سپردگی
اک سانپ تھا، جو سارے بدن سے لپٹ گیا

یہ کیا ضرور، کہہ کے پکارو چراغ اُسے
فانوس کے بدن میں، جو شعلا سمٹ گیا

مارا تھا اُس نے ہاتھ تو بے حد جنچا تُلا
گردن ہی اتنی سخت تھی، خنجر اُچٹ گیا

اس دور کے جنازے، کہاں ہونگے دفن اب
میرے لہو کی راکھ سے، وہ غار پٹ گیا

ہوں مدّعی سخن کا، مگر کی جب اُس سے بات
جملے غلط سے ہو گئے، مفہوم اُلٹ گیا

اب کیا رہا، جو ماتم لوح و قلم کروں
تحفے سا، میں خود اپنے رفیقوں میں بٹ گیا

کچھ انفرادیت کے تقاضے بھی ہیں فضاؔ
میرا شعور، عام گزرگہ سے ہٹ گیا

فن کو اک تفریح کہہ کر، خوش ہیں ہم سے لوگ بھی
کس قدر کم ذوق نکلے آج کل کے لوگ بھی

کچھ شکستِ ذات کی آواز سے چونکے تو ہیں
ذات کی دہلیز میں، صدیوں سے بیٹھے لوگ بھی

پاؤں رکھتے ہی زمیں پر، آسماں سر پہ گرا
ریزہ ریزہ ہو کے بکھرے، دھن کے پکے لوگ بھی

جاں فزا کتنی ہے، میرے شہر کی آب و ہوا
زہر میں ڈوبے رہے، اکسیر جیسے لوگ بھی

چپکے چپکے، جل رہے ہیں اندروں کی دھوپ میں
نخلِ صحرا ہیں، صنوبر سے گھنیرے لوگ بھی

کیا ہمارا ذکر، ہم کب اتنے دنیا ساز تھے
تذکرہ اتوں میں اُس کی اچھے خاصے لوگ بھی

رُوح ہیں ویرانیاں پلکوں پہ خوابوں کے چراغ
کن تضادوں کا مرقع ہیں، ہم ایسے لوگ بھی

کیا کہوں، جھونکا ہوا کا کِس طرف لیجائے گا
وقت کی راہوں میں، اُڑتی گرد ٹھہرے لوگ بھی

جلد ہو جاتے ہیں میلے، ہوں اگر کپڑے سفید
تہمتوں سے بچ سکے کب، صاف سُتھرے لوگ بھی

ذہن میں کب تک دبا رہتا، بغاوت کا شعور
بن گئے تیشہ، سِپَر انداختہ سے لوگ بھی

کچھ بہ نامِ حُرمتِ فن بھی، فضاؔ لکھتے رہو
ہیں تمہارے دَور میں، زندہ پُرانے لوگ بھی

○

بے کراں موج کو، ساحل پہ اُچھالے کتنا
وہ بھی حیراں ہے، مرا ظرف کھنگالے کتنا

درسِ تہذیبِ ہُنر ہوں، مجھے پڑھ کر دیکھیں
لوگ ڈھونڈھیں گے کتابوں میں حوالے کتنا

دل بجھا، چور ہوئے خواب، ارادے ٹوٹے
بوجھ، اک ریت کی دیوار سنبھالے کتنا

میں کہ اک نکتہ ہوں، خاموش سا، سنجیدہ سا
مجھ کو الفاظ کے پیکر میں وہ ڈھالے کتنا

ہے بہت نرم فضا شعر و بصیرت کی سرشت
زور، احساسِ انا پر کوئی ڈالے کتنا

سیم و گُہر، نہ تاج و کمر چاہیئے ہمیں
دادِ ہُنر، بہ طرزِ دگر چاہیئے ہمیں

زخموں سے چور چور ہیں، سب کی بصیرتیں
کِس سے کہیں، شعورِ نظر چاہیئے ہمیں

ہے رہروانِ شوق کو، یہ بانکپن بہت
چہرے پہ بس غبارِ سفر چاہیئے ہمیں

اوروں سے، مختلف ہے ہمارا معاملہ
شوریدہ سر ہیں، دشت میں گھر چاہیئے ہمیں

تم شوق سے خلاؤں کی پیمائشیں کرو
اپنی زمیں پہ راہ گزر چاہیئے ہمیں

خنجر اُٹھا! کہ دیر سے مقتل ہیں بے چراغ
ہر آستین، خون سے تر چاہیئے ہمیں

یہ ذات کا طِلسم، یہ بے منظری کی دُھند
یوں ہے کہ چشمِ خویش نگر چاہیئے ہمیں

تیشہ زنی تو شیوۂ اہلِ قلم نہیں
ہیرے تراشنے کا، ہنر چاہیئے ہمیں

کیوں اے فضا چراغ جلائیں چراغ سے
خورشید اپنا، اپنی سحر چاہیئے ہمیں

اسی کا عکس ہے، ہر آئینے میں بکھرا ہوا
وہ ایک چہرہ، جو بے خط و خال اتنا تھا

نوائے غم ہے، متاعِ سخن ابھی مجھ کو
ملا ہے زخم، بہ شکلِ دہن ابھی مجھ کو

لباسِ نکہتِ گُل بھی، دریدہ ہے کتنا
چمن میں رہنے دو، بے پیرہن ابھی مجھ کو

بہار راہ بھٹک جائے گی، جلائے رکھ!
سرِ دریچۂ نسیمِ سمن ابھی مجھ کو

وہ خسروی کا فسوں، جیسے اب بھی زندہ ہے
ملے تھے راہ میں، کچھ کوہ کن ابھی مجھ کو

ہر ایک سانس میں سو نیشتر چبھوئے فضا
مگر نہ آسکا جینے کا فن ابھی مجھ کو

خال و خط دھند میں ڈوبے ڈوبے لگیں، آئنہ آئنہ عکس دھورا لگے
ہے وہی انجمن، پھر یہ کیا بات ہے، اجنبی مجھ کو ایک ایک چہرا لگے

عمر اپنی سیہ روزیوں میں کٹی، لقمۂ شب ہوئے ہم، مگر دوستو!
حادثہ تم پہ گزرے نہ ایسا کبھی، دھوپ آنگن میں ہو، گھر اندھیرا لگے

کون پکڑے انھیں، کس کے ہاتھ آئیں یہ، زندگی ہے کہ خوابوں کی پرچھائیاں
سارے منظر ہیں بے منظری کے ہدف، دھوپ اُترتی لگے، سایہ اُڑتا لگے

سانس آہستہ لیتا ہوں اس خوف سے، دفعتاً ٹوٹ کر رہ نہ جاؤں کہیں
اتنا حساس ہوں میں کہ ہر حادثہ، روح سے میری ہو کر گزرتا لگے

ڈوب کر میں لہو میں رہا مطمئن، اس پہ حیرت رہی قاتلوں کو مرے
کن عناصر کا پیکر ہے یہ شخص بھی، قتل ہو کر بھی ظالم، مسیحا لگے

اتنی سانسیں کوئی سانس اپنی نہیں، اتنے لمحے کوئی لمحہ اپنا نہیں
آخر اس ربط کی معنویت ہے کیا، اُس سے قربت بھی دوری کا رشتہ لگے

وقت کی دھوپ کو پھینک آؤں کہیں، اور شدت بڑھی تو جھلس جاؤں گا
میں تو قطرہ ہوں، قطرے کی اوقات کیا، ایسی رُت ہے کہ دریا بھی پیاسا لگے

گو کسی سے ذرا بھی تعارف نہیں، تیری بستی کے نو واردوں میں سہی
کس قدر پھر بھی اپنائیت ہے یہاں، جس کو دیکھوں وہ اپنا شناسا لگے

ایک دلدار خوشبو میں ڈوبے ہوئے، ارغوانی سے موڑ، اُجلی پگڈنڈیاں
کس طرف جاؤں آخر، کہ ہر راستا، تیرے ہی گھر کا مانوس رستا لگے

اُس کو کس چیز سے کوئی تشبیہ دے، ساتوں رنگوں کا شاداب پیکر ہے وہ
جب چلے تو، دھنک سی بکھرتی لگے، راہ گلزار منظر سنہرا لگے

تو نہ ہوتا تو، پھر کوئی الجھن نہ تھی، میں بھی رہتا زمانے میں ہم بجاں
کربِ خود آگہی! اب یہ کس سے کہوں، ہر خراش اپنے چہرے کا حِصّہ لگے

چھوڑے پیچھا، یہ آشوبِ جاں تو مرا، ہے زباں پر وہی خون کا ذائقہ
گھُل گئی کیسی تلخی یہ احساس ہیں، بوسۂ لب کبھی چکھوں تو کڑوا لگے

آج کے دور کا تو ہے سب کچھ الگ، خواب الگ، تجربے اور مسائل الگ
ہم وہاں ہیں، جہاں کا ہر اک آدمی جسم رکھتے ہوئے، محض سایا لگے

لفظ ادھورے ہیں، مفہوم الجھے ہوئے، شاعری اور ادب کی وہ قدریں کہاں
دائرہ فکر و فن کا سمٹتا لگے، عہدِ ذوق و نظر، ختم ہوتا لگے

سر سے پا تک، تخیل میں ڈوبا ہوا، ہے عجب شخص، کہتے ہیں جس کو فضاؔ
وضع میں اپنی ہر ایک سے منفرد، شہر کی بھیڑ میں بھی اکیلا لگے

تجھ کو، روتا ہوں، اب اے موجِ خیال
قطرہ قطرہ، مرا دریا بکھرا

○

لکھ حرفِ زندگی، قلمِ خوں چکاں نہ روک
ہو جائے خون بھی جو کلیجہ، زباں نہ روک

دھندلا نہ جائے یوں، تری بربادیوں کا حسن
جلتا ہو گھر، تو آگ کے اوپر دھواں نہ روک

اتنا ہی اب بہت ہے، زمیں کو سنبھالے رکھ
تو اپنے سر پہ، گرتے ہوئے آسماں نہ روک

ہر راستہ گیا ہے کسی قتل گاہ تک
نکلوں جو میں کبھی، لے کے خدنگ و کماں، نہ روک

جم جاؤں برف سا، جو نہ کھاؤں دکھوں کی آنچ
اس دھوپ کو، سرِ شجر و سائباں نہ روک

گزری ہے پوری عمر تو، شعلوں کے درمیاں
یہ شہرِ گل ہے، میری سواری یہاں نہ روک

لیلائے عصر کے لئے، محمل نئے تراش
اس کو، قریبِ حجلہ گہہِ دلبراں نہ روک

یہ زہر، پورے جسم میں اب پھیل جائے گا
الفاظ کو نکلنے دے باہر، زباں نہ روک

بدن بدن ہے پریشاں، غبارِ جاں میرا
مگر ہے شوق، اسی رہ گزر میں رہنے کا

ہر ایک سانس ہے، ضربِ ہزار سنگ، یہ دیکھ!
نتیجہ، صحبتِ موجِ گہر میں رہنے کا

○

ہنر کے نام پہ، تخلیقِ غم کی دھوپ میں جل
اٹھا لیا ہے قلم تو، قلم کی دھوپ میں جل

شعورِ گرم روی، کچھ یوں ہی نہیں آتا
مری طرح، مرے نقشِ قدم کی دھوپ میں جل

تجھے بہت ہے، تہی دامنی کا سایہ کبھی
غریبِ شہر! نہ دستِ کرم کی دھوپ میں جل

ابھی بہت سے، چکانے ہیں زندگی کے حساب
ابھی، نہ مرحلۂ بیش و کم کی دھوپ میں جل

یہاں تجھے ہے، بہر حال راکھ ہو جانا
خوشی کی آگ میں جل، یا الم کی دھوپ میں جل

خود اپنا درد تو، کچھ سایہ دار ہوتا ہے
جو دوسرے ہیں، ذرا ان کے غم کی دھوپ میں جل

یہی عذاب، نصیبِ نظر وراں ہے فضا!
تمام عمر، سلگتے قلم کی دھوپ میں جل

مذاقِ دیدۂ بینا بھی معتبر نہ رہا
بھٹک گئے، ہمیں خود راستا دکھا کے چراغ

بہت سی آنکھیں ہیں، چہرے پہ اس طرح روشن
کہ جیسے رکھ دے کوئی طاق پر، بجھا کے چراغ

یوں تو وہ بھی ادپرے، زرنگار ہے کیسا، باوقار ہے کتنا
اس کو تم کبھی برتو، پھر سمجھ میں آئے گا، خوش عیار ہے کتنا

لوگ آنکھیں رکھتے ہیں، رِستے زخم کی صورت، پھول جیسے چہرے پر
نشترِ تماشا کا یہ حسین منظر بھی، سوگوار ہے کتنا

راہرو محبت کے، بس یہیں مٹاتے ہیں، بیٹھ کر تھکن اپنی
کیا بتاؤں دل والو! یہ شجر بھی نفرت کا، سایہ دار ہے کتنا

تم کو کیا خبر اس کی، قافلے معانی کے، اس میں کھو گئے کتنے
کس کو اس کا اندازہ، حرف و لفظ کا صحرا، بے کنار ہے کتنا

دُکھ کا زہر پی پی کر، ہنستے گاتے لمحوں کا، قرض بھرتا رہتا ہوں
کیا کہوں، مرے اوپر کاروبارِ ہستی میں اب ادھار ہے کتنا

میں تو مل کے مٹی میں، پھول بن کے مہکا ہوں، رنگ بن کے بکھرا ہوں
غور سے ذرا دیکھو! جسم و جاں کا یہ رشتہ، پائدار ہے کتنا

بے لباس پھرتے ہیں، آگہی کی گلیوں میں، وقت طعنے دیتا ہے
دیکھ! شرمِ رسوائی، یہ ہنر کا پیراہن، تار تار ہے کتنا

وہ جو ایک شاعر ہے، نام ہے فضا جس کا، مختلف ہے اوروں سے
اس کا شبنمیں لہجہ، باوجود نرمی کے، باوقار ہے کتنا

جاگیرِ قیس ہی کی نہیں، اب زمینِ نجد
ایک ایک شخص ہے سگِ لیلیٰ گزیدہ سا

مطلب یہ ہے، کہ مجھ کو ذرا غور سے پڑھو
جملہ کتابِ دہر کا ہوں خطِ کشیدہ سا

○

یہ سب قبول، جلاؤ ہمیں، بجھاؤ ہمیں
کہیں تو لے چلو، سنکی ہوئی ہواؤ ہمیں

مرا خیال، ابھی تم کو زیرِ لب رکھوں
مگر، تمھیں ہے یہ اصرار، گنگناؤ ہمیں

اس انجمن میں جلیں گے، کہ ہیں بہت سے چراغ
کسی دریچۂ احساس میں جلاؤ ہمیں

الگ ہے اپنی ادا، پھول بھی ہیں خنجر بھی
وہ آستیں ہو کہ دامن، کہیں چھپاؤ ہمیں

اس آئینے میں، چلو، جائزہ ہی لیں اپنا
ہمارے دور کا چہرہ، ذرا دکھاؤ ہمیں

نہیں گلاب، کہ رونق بنیں گے آنگن کی
چمکتی دھوپ ہیں، دیوار پر سجاؤ ہمیں

ابھی تو، جوئے تنک آب ہیں فضا ہم بھی
کہاں ملا، ترے آہنگ کا بہاؤ ہمیں

کس کو، مقدمات کی ترتیب کا تھا ہوش
اس سے جو بات بھی ہوئی، بس بات بھر ہوئی

جو، میری سادگی نے ودیعت کیے مجھے
مجھ کو شکست بھی، انھیں حالات بھر ہوئی

○

کوئی ہجوم میں تجھ کو نہ راستا دے گا
سراغ اس کا، ہمارا ہی نقشِ پا دے گا

کسے یہ فکر، بدن کو سنبھال کر رکھے
دکھوں کا سیل تو، دیوارِ جاں گرا دے گا

جنوں کے نام پہ سب بے لباس ہیں، پھر کون
بصیرتوں کو مری، خلعت و قبا دے گا

ترا وجود ہے، ساون کے ابر کا ٹکڑا
یہ میری پیاس کو کچھ دن تو آسرا دے گا

پھر آئیں جاڑے کی راتیں، کہانیاں چھیڑو!
کوئی الاؤ بھی چوپال میں جلا دے گا

کسی افق پہ سجا لے کہ نور کی ہوں کرن
نہیں ہوں آگ کا شعلہ، کہ تو ہوا دے گا

ستارۂ سحری کو، بہت حقیر نہ جان!
یہی تجھے، ترے خورشید کا پتا دے گا

کھڑا ہوں دیر سے، دہلیزِ وقت پر چپ چاپ
کوئی تو مجھ کو کبھی، دعوتِ نوا دے گا

یہ میرے دور کے ناقد ہیں، کیا خبر تھی مجھے
زمانہ ہاتھ میں اندھوں کے، آئنا دے گا

ذرا بطونِ معانی میں اب اترنا سیکھ!
شعورِ لفظ، تجھے مڑ کے خود صدا دے گا

فضا کچھ اور تپا اپنے آپ کو، اک روز
یہ سوزِ جاں، ترے لہجے کو جگمگا دے گا

خود کو ہر لمحہ، نہ جلتی آگ کے پہلو میں رکھ
ہے بہت سرکش انا تیرا، اسے قابو میں رکھ

شیوۂ فرہاد پر تنقید کرتا ہے بہت
کچھ دنوں اس شخص کو بھی مکتبِ خسرو میں رکھ

جو تری آشفتگی کو، کچھ توازن دے سکے
دل کے شعلے کو، بھگو کر آنکھ کے آنسو میں رکھ

تو ہے پاگل، گھر کی ویرانی کو بہلائے گا کون!
قیدِ صحرا کو، نہ زنجیرِ رمِ آہو میں رکھ

لوگ، جس کو خطِ تجدیدِ رفاقت کہہ سکیں
اک شکن میرے لیے، ایسی بھی تو ابرو میں رکھ

ورنہ چپکے سے، ہوا اک دن چرا لے جائے گی
تو بسا کر مجھ کو، اپنے جسم کی خوشبو میں رکھ

تجھ سے رہ کر دور بھی، زنجیریِ حالات ہوں
یا مجھے آزاد کر، یا حلقۂ گیسو میں رکھ

یہ حوادث تو، ہیں تیری زندگی کی دھوپ چھاؤں
زندگی پر دسترس کی قوتیں، بازو میں رکھ

تیغ کی صورت، تجھے سونپا گیا ہے یہ نفس
عمر بھر اس کو، نیامِ سینۂ و پہلو میں رکھ

خون کی تحریر، پانی پر نہ لکھی جا سکی
اس جراحت کو بھی، جیبِ لالۂ خودرو میں رکھ

بات منہ کی، ڈھونڈھ لے گی معنویت کی مٹھاس
تازگی آہنگ کی، آواز کے جادو میں رکھ

آہ کو بادِ صبا، درد کو خوشبو لکھنا
ہے بجا، زخمِ بدن کو گلِ خودرو لکھنا

درد، بھیگی ہوئی راتوں میں چمک اٹھا ہے
ہم کو لکھنا ہے تو، برسات کا جگنو لکھنا

خواب ٹکرا کے حقائق سے ہوئے صد پارہ
اب انھیں آنکھ سے ڈھلکے ہوئے آنسو لکھنا

تو نے سلطانیِ جمہور! بدل دیں قدریں
آج فرہاد کو، مشکل نہیں خسرو لکھنا

اب مناسب نہیں ہم عصرِ غزل کو یارو!
کسی بجتی ہوئی پازیب کا گھونگھرو لکھنا

ہنر افشانیِ خامہ کو، دعا دو کہ فضا
لفظ کو، سہل ہوا نافۂ آہو لکھنا

○

بن کر وہ درد، جب دل و جاں میں اتر گیا
سب کچھ، حدِ زمان و مکاں میں اتر گیا

دامن پہ، رہ گئی ہے تہی دستیوں کی گرد
جو نفع تھا، وہ جیبِ زیاں میں اتر گیا

پہنچا مگر، نہ اپنے نشانے پہ کوئی تیر
بازو کا سارا زور، کماں میں اتر گیا

پھرتا اٹھائے کاندھے پہ، کب تک بدن کا بوجھ
چپکے سے وہ بھی، وادیِ جاں میں اتر گیا

انفاس کے دھوئیں سے، ہے بوجھل فضائے جسم
تو بھی، یہ کس سلگتے مکاں میں اتر گیا

کچھ اتنے، زندگی میں ہوئے تلخ تجربے
سارے بدن کا زہر زباں میں اتر گیا

مجبور تھا، تھکن سے، ہوس کا پرندہ بھی
شعلے پہ، شاخِ گل کے گماں میں اتر گیا

مشکل بہت تھا، مرحلۂ عکس و آئینہ
میں پھر بھی، چشمِ خوش نگہاں میں اتر گیا

آیا تھا باغِ دہر میں، موسم کب اتنا سخت
اب کے، تو سب کا رنگ، خزاں میں اتر گیا

حرف و نوا کی سطح پہ، سب ڈولتے رہے
میں، اندرونِ لفظ و بیاں میں اتر گیا

تنہاؔ غزل کی دین ہے، یہ تازگی فضا
نغموں کا رس، گلوئے فغاں میں اتر گیا

○

بستی سمجھ کے، دشتِ ہُنر میں اتر گیا
میں بھی، یہ کیسے اجڑے کھنڈر میں اتر گیا

ہمت نہ تھی، کہ بڑھ کے سمندر کھنگالتا
ساحل پہ وہ تلاشِ گہر میں اتر گیا

آساں نہیں تھی، معرفتِ کائناتِ ذات
یہ زہر کیسے رُوحِ بشر میں اتر گیا

اے آفتابِ نیم شبی! آئینہ تو دیکھ
تو کِس سیاہ بخت کے گھر میں اتر گیا

کس کو ملی، یہ جلوۂ و منظر کی آگہی
گزرا نظر سے جو، وہ نظر میں اتر گیا

پھر بھی ہے خوش گوار بہت اس چمن کی دھوپ
موسم کا رس تو، برگ و ثمر میں اتر گیا

کیوں سب کے سر کا بوجھ ہو، سودائے خیر و شر
اچھا ہوا، کہ یہ مرے سر میں اتر گیا

اک بحرِ بیکراں ہے مگر، قطرگیِ ذات
یہ میں کہاں، خود اپنی خبر میں اتر گیا

تھا مجھ پہ ایک عمر سے، شوریدگی کا قرض
سو وہ بھی، زندگی کے سفر میں اتر گیا

پھرتا کہاں، لئے ہوئے میں حسرتوں کی آگ
خود اپنی کشتِ فکر و نظر میں اتر گیا

وہ کون تھا، جو وادیِ ظلمات میں فضا
لے کر چراغ دستِ ہنر میں، اتر گیا

نہیں کہتا، مرے زخموں کا صلا دے مجھ کو
سُرخ یاقوت کی بنیاد ہوں، ڈھلا دے مجھ کو

نہ سہی جسم، شعاعوں کے پر و بال تو دے
یعنی شبنم ہوں تو سورج سے ملا دے مجھ کو

یونہیں کب تک رہوں، خوابوں کے کھنڈر کی صورت
ایک اجڑی ہوئی بستی ہوں، بسا دے مجھ کو

یہ گوارا ہے، مجھے بانٹ لیں مل کر سب لوگ
لیکن اب خاک سے، اکسیر بنا دے مجھ کو

ناپسندیدہ اگر ہے، مری گل گونیِ طبع
انتقاماً انھیں کانٹوں پہ سلا دے مجھ کو

صورتِ بادِ صبا ، میں بھی ہوں آوارہ بہت
موجِ گل ! تو کوئی زنجیر پنہا دے مجھ کو

اک ذرا ، فاصلۂ رُوح و بدن تو کم ہو
میں کہ ہوں بیچ کی دیوار گرا دے مجھ کو

خرمنِ شعلۂ نو ہیں، تو وہ گرمی ہی نہیں
آتشِ رفتہ سہی ، پھر سے جلا دے مجھ کو

میں بھی کاغذ کا سفینہ ہوں قلم کی سوگند
علم و دانش کے سمندر میں، بہا دے مجھ کو

سر سے ہوں پاؤں تلک ، دیدۂ بینا کی طرح
زندگی ! اب کسی چہرے پہ سجا دے مجھ کو

میں بھی مجرم ہوں جو پیچیدہ بیانی کا فضاؔ
کوئی ترسیل کی سولی پہ چڑھا دے مجھ کو

آنکھوں میں لے کے خوابِ عدم جاگتے رہیں
یہ شرطِ زندگی ہے، کہ ہم جاگتے رہیں

جھپکیں ذرا جو پلکیں، گزر جائے گا یہ پل
یارانِ تیز گام! قدم جاگتے رہیں

میں سُن رہا ہوں دیر سے، تیشے کی آہٹیں
پہلو میں پتھروں کے صنم جاگتے رہیں

دل کی خلش کو، لب کا تبسم سُلا نہ دے
ایسا کرو، کہ رُوح میں غم جاگتے رہیں

آبِ رواں پہ سہل نہیں نقش کھینچنا
دیدہ ورانِ لوح و قلم جاگتے رہیں

ہیں ان کی داستاں کا وہی نقطۂ عروج
بُت بھی یہ چاہتے ہیں، حرم جاگتے رہیں

کرنا ہے اور ابھی، عرب کی لَے کو تیز تر
خنیاگرانِ بزمِ عجم، جاگتے رہیں

لکھنا تو ہے ہمیں کو، فضا حرفِ نیم شب
ہاتھوں میں آؤ لے کے قلم، جاگتے رہیں

زباں تو کاٹ لی ہے، مصلحت آموز دانش نے
مری خاموشیوں کو، بولتے کنکر پہ لکھ دینا

چمن والے، خود اپنے آپ سے واقف نہیں شاید
مرے سوکھے ہوئے موسم کو، برگِ تر پہ لکھ دینا

○

صحرا سے دور، دھوپ میں چلنا پڑا ہے اب
کس دو پہر میں، گھر سے نکلنا پڑا ہے اب

میرا ہی آسمان مجھے پہچانتا نہیں
کیسی بلندیوں سے پھسلنا پڑا ہے اب

کون آنے والی رات میں، شمعیں جلائے گا
سورج کے ساتھ، ہمکو بھی ڈھلنا پڑا ہے اب

تھا سادگیِ وضع میں، اپنا زیاں بہت
چہرے کا وہ نقاب بدلنا پڑا ہے اب

اتنا تو پاگداز نہ تھا، وقت کا سفر
منزل پہ آگیے تو، سنبھلنا پڑا ہے اب

رفتارِ فکر میں وہ توازن کہاں سے لائیں
لفظوں کے پُل صراط پہ چلنا پڑا ہے اب

ایسا تو شہر میں کبھی قحطِ سخن نہ تھا
اپنا ہی شعر سن کے، بہلنا پڑا ہے اب

سہتا ہمیشہ کون بھلا، وقت کا دباؤ
دریا کو، ساحلوں سے ابلنا پڑا ہے اب

گُل کاریِ قلم پہ، بڑا ناز تھا اسے
سیروں لہو، فضا کو اگلنا پڑا ہے اب

راستا روک لیا، بن کے اسی نے دیوار
دشت میں، گھر سے جو دروازہ اٹھا لائے تھے

○

ایک بس میرے سوا، جرم ہے ہلکا سب کا
کس طرح بوجھ اٹھائے پھروں تنہا سب کا

ذائقہ منہ کا، بدلنے کو چلے تھے احباب
چاٹ کر زہر بدن پڑ گیا نیلا سب کا

میں نہ کہتا تھا کہ سائے کا بھروسا ہے غلط
جب چڑھی دھوپ، تو قد ہو گیا چھوٹا سب کا

سب نے کاندھے پہ مرے، اپنی صلیبیں رکھ دیں
بات سچ کہہ دی تو، منہ ہو گیا کڑوا سب کا

اب کے، موسم ہے بہت سخت جھلس جاؤ گے
رنگ اُتر جائے گا، ہلکا ہو کہ گہرا سب کا

ہے مرے عہد کی میراث، یہ پسپائی بھی
میں ہوں یا آپ، یہاں حوصلہ ٹوٹا سب کا

کس طرح رات کی دہلیز سے باہر نکلوں
چاند ہوں، میرا مقدر ہے اندھیرا سب کا

اپنی بستی میں حُسین ابن علی ہوں لوگو!
پیاس میری ہے، امنڈتا ہوا دریا سب کا

اک ذرا میری طرح، لوگ اُجڑ کر دیکھیں
میں ہی کیوں، روز سمیٹے پھروں، صحرا سب کا

یہی مٹی ہے، جو کشتِ مہ و انجُم ٹھہری
یہی مٹی ہے، کہ سورج یہیں ڈوبا سب کا

کوئی چہرہ بھی، مجھے اپنا شناسا نہ ملا
کس اُسی سے ہے، مرے شہر میں رشتا سب کا

راہ چلتے، وہ مرے پاس رُکا تھا کچھ دیر
یہ الگ بات، کہ رستہ ہوا کھوٹا سب کا

سرگزشت اپنی ہی، بکھری ہے ورق تا بہ ورق
میں نے لکھنے کو تو یوں ماجرا لکھا سب کا

دیکھو! اب وقت کا منصف، مجھے کس کو بخشے
ہوں وہ ترکہ، کہ ہے جس کے لئے دعویٰ سب کا

اپنے افکار و اسالیب کی سطحیں دیکھو
ایک قیمت پہ تو چلتا نہیں سکہ سب کا

کون لفظوں کے در و بست سے آگے نکلا
میں نے معنی کی طرح، ذہن ٹٹولا سب کا

کس کو آسودہ کیا، وقت کی راتوں نے فضا
کُھل گئی آنکھ، رہا خواب ادھورا سب کا

○

کون پڑھتا، اس میں تھی، نظروں کی رُسوائی بہت
ورنہ چہروں پر تھی، تحریرِ شناسائی بہت

وقت کی بے منظری نے جھونک دی آنکھوں میں خاک
ورنہ ہم کو بھی یہاں تھا زعمِ بینائی بہت

رات کو، یہ آسماں بھر چاندنی دے جائے گا
دن کے سورج نے سمیٹی ہے توانائی بہت

ان کی خاطر کیوں کسی دریا کو زحمت دیجیے
ہے تُنک ظرفوں کو، اک قطرے کی گہرائی بہت

بام و در سے ہے ابھی لپٹی ہوئی راتوں کی یاد
میرے آنگن میں اتر کر دھوپ پچھتائی بہت

زندگی بہلے گی ان جھوٹے سہاروں سے کہاں
خواب تو ہیں مختصر، راتوں کی لمبائی بہت

ڈال دی ہے سارے چہرے پر بصیرت نے خراش
زندگی نے آئینہ دیکھا، تو گھبرائی بہت

نطق ولب سے اپنا رشتہ توڑ لو اور چپ رہو!
دل جلوں کو ہے یہی تہذیبِ گویائی بہت

کون ورنہ رات بھر یوں شعر لکھتا، جاگتا
میں نے کی ہے تیرے خوابوں کی مسیحائی بہت

اور اب اظہار کا کوئی وسیلہ ڈھونڈیے
ہو چکی اہلِ سخن! لفظوں کی رسوائی بہت

اُس کی دولت ہو کہ تیرے فن کی شہرت اے فضا
اپنے اپنے رنگ میں دونوں ہیں ہرجائی بہت

○

ہر آدمی، لہو کا شناور ملا ہمیں
دیکھا نہ جا سکا، وہی منظر ملا ہمیں

قطرے کی آگہی بھی، میسر نہیں یہاں
اس کی ہو کیا خوشی کہ سمندر ملا ہمیں

یہ سوچتے ہیں اب، اسی جنگل میں آ بسیں
کتنا سکون، شہر کے باہر ملا ہمیں

جامہ دری کے بعد بھی عریاں ہوئے نہ ہم
زخمِ بدن، بہ صورتِ چادر ملا ہمیں

کیا لوگ تھے، جو آگ کو گلزار کر گئے
سو بھی سکے نہ ہم، جو یہ بستر ملا ہمیں

صورت تو کیا، ترس گئے ہم تو صدا کو بھی
اُس کی گلی سے دور، کہاں گھر ملا ہمیں

سر پر سنبھل سکی نہ کلاہِ ہُنروراں
ہر آسماں، زمیں کے برابر ملا ہمیں

رکھی اُسی پہ ہم نے رفیقو! اساسِ فن
جو کچھ، حدِ شعور کے اندر ملا ہمیں

ہم رفتہ رفتہ، سارے زمانے سے مل چکے
اب ایک روز، ہم سے بھی، چل کر ملا ہمیں

اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
غالبؔ سے کم نہ کوئی سخنور ملا ہمیں

ہم بھی فضا ہیں، نخلِ ثمر دار کی طرح
پھل، غیر کا نصیب تھے، پتھر ملا ہمیں

○

قید لفظوں کی، اُٹھا دی جائے
یوں معانی کو صدا دی جائے

پھر بہار آئی، نئے پھول کھلے
آؤ! زخموں کو دُعا دی جائے

کون جاگے گا، سحر ہونے تک
شمع یادوں کی بجھا دی جائے

جسم کیسا، نہ جلا دامن بھی
اور شعلوں کو ہوا دی جائے

کہیں رُکتے نہیں لمحوں کے قدم
ان کو زنجیر پنھا دی جائے

زندگی، اور یہ خوابوں کی تھکن
عمر راتوں کی گھٹا دی جائے

پیاس، موجوں نے بجھائی کس کی
آگ دریا میں لگا دی جائے

مجھ کو، کاغذ پہ نہ لکھ، کیا معلوم
کب یہ تحریر جلا دی جائے

یہی اچھا ہے، کہ اب دولتِ فن
کہیں، مٹی میں دبا دی جائے

ہم تو جل بجھ کے ہوئے راکھ فضا
کیسے اب دادِ وفا دی جائے

سفر کا حال کسی ہم سفر سے کیا پوچھیں
یہ خود ہے آبلہ پا، رہگزر سے کیا پوچھیں

اس انجمن میں کسی کا مزاج کبھی تو ملے
ہوا سے بات کریں کیا، شرر سے کیا پوچھیں

جو شخص ہے نظر آتا ہے خالی سا
سمندرو! صدفِ بے گہر سے کیا پوچھیں

جئیں گے کیسے پشیمانیوں کے عہد میں ہم
ہنر بھی عیب ہوا اب، ہنر سے کیا پوچھیں

خبر نہیں تھی، کہ آئینہ ٹوٹ جائے گا
کہاں لُٹی؟ یہ متاعِ نظر سے کیا پوچھیں

خود اپنی چھاؤں کو، بے چارہ عمر بھر ترسا
جلا ہے دھوپ میں تنہا، شجر سے کیا پوچھیں

حقیقتیں ہیں گریزاں، قلم سے کیا لکھیں
شعور گنگ ہے، علم و خبر سے کیا پوچھیں

ابھی شروع ہوا ہے، سفر ہمارے لئے
ہنوز، سلسلۂ بحر و بَر سے کیا پوچھیں

فضا اداس ہے آنگن، منڈیریں ہیں چُپ چاپ
ہوا یہ سانحہ کیا، اپنے گھر سے کیا پوچھیں

○

نہ دامنوں میں یہاں خاکِ رہ گزر باندھو
مثالِ نکہتِ گل، محملِ سفر باندھو

اس آئینے میں کوئی عکس یوں نہ اُبھرے گا
نظر سے، سلسلۂ دانشِ نظر باندھو

جو صاحبانِ بصیرت تھے، بے لباس ہوئے
فضیلتوں کی یہ دستار کس کے سر باندھو

سفیرِ جاں ہوں، حصارِ بدن میں کیا ٹھہروں
چمن پرستو! نہ خوشبو کے بال و پر باندھو

نہ ٹوٹ جائے، کہ نازک ہے رشتۂ انفاس
طنابِ خیمۂ ہستی، سنبھال کر باندھو

پھرے ہے کب سے، پریشاں یہ زخم خوردہ ہرن
جنوں کو، دشت سے لیجا کر اپنے گھر باندھو

گیا وہ دور، کہ جب برف برف تھے الفاظ
گرہ میں اب، یہ دہکتے ہوئے شرر باندھو

ادب نہیں ہے ریاضی کا مسئلہ یارو!
ہر ایک شخص پہ کیوں تہمتِ ہُنر باندھو

یہ صنف، آبروئے فنِ شاعری ہے نفتاؔ
غزل کہو، تو مضامینِ معتبر باندھو

جنوں کی وضع و روش پر، تھے معترض کچھ لوگ
میں چپ رہا، کہ گریباں دریدہ میں بھی تھا

لفظ و معنی کی طرف، یوں تو سفر ہے سب کا
کیوں مرا فن وہی ٹھہرے، جو ہُنر ہے سب کا

تیرے کوچے میں حریفوں سے ملاقات ہوئی
کیا خبر تھی، کہ یہی راہ گزر ہے سب کا

کوئی آوارگیِ وقت کی زد سے نہ بچا
جو بیاباں تھا مرا، اب وہی گھر ہے سب کا

سب کو یہ زعم، حقائق ہیں ہماری دریافت
یہ الگ بات، سرابوں میں سفر ہے سب کا

کون، افسوں کدۂ ذات سے باہر نکلے
اب یہی دائرۂ حرف و ہُنر ہے سب کا

موسمِ عشق و ہوس خشک ہی گزرا اب کے
اس کے باوصف کبھی، دامن ہے کہ تر ہے سب کا

یہ مرا تیرا نفس ہے کہ ہے پتجھڑ کی ہوا
اس بھرے باغ میں بے برگ شجر ہے سب کا

آندھیوں میں، اڑ گئیں گھر کی چھتیں مدت ہوئی
دھوپ ہم کو بھیجنا، تو سائبانی بھیجنا

خیمۂ گردِ عدم ہے، منزلِ ہستی تمام
کیا ضروری تھا، یہ رختِ رائگانی بھیجنا

نہ ایسے جرم پہ، خود کو کبھی معاف کروں
رہوں شجر تلے، سائے سے اختلاف کروں

تمام عمر، ابھی تو یونہی بکھرنا ہے
سفر ہو ختم، تو چہرے کی گرد صاف کروں

مرا وجود بھی، پتھر اسی کے نام کا ہے
حرم سے نکلوں تو اپنا ہی اب طواف کروں

یہ کائنات ہے محدود، ذات لامحدود
میں اپنی ذات کا، کس طرح انکشاف کروں

بلا سے، راس نہ آیا قیام شہر مجھے
نہیں ہوں قیس، کہ صحرا میں اعتکاف کروں

بجا، کہ بے ہنری کے نشاں بدن پر ہیں
یہ داغ تو نہیں، جن کو تہِ غلاف کروں

جدید لفظ سہی، ہوں روایتوں کا اسیر
کہاں تک اپنے معانی سے انحراف کروں

مری کتاب پہ لکھا ہے تبصرہ اس نے
فضاؔ اب اس کے ہنر کا بھی اعتراف کروں

وقت کے اس بے اماں موسم میں، مجھ کو ساتھ رکھ
دھوپ پھیلے گی، تو سائے کی قبا بن جاؤں گا

دیکھنے میں ہوں بہت بے وضع، پتھر کی طرح
بس، سلیقے سے تراشو! آئنا بن جاؤں گا

○

بساطِ دانش و حرف و ہنر، کہاں کھولیں
یہ سوچتے ہیں، لبِ معتبر کہاں کھولیں

عجب حصار، ہیں سب اپنے گرد کھینچے ہوئے
وجود کی وہی دیوار، در کہاں کھولیں

پڑاؤ ڈالیں کہاں، راستے میں شام ہوئی
بھنور ہیں سامنے، رختِ سفر کہاں کھولیں

یہاں، شعور کے ناخن تو ہم بھی رکھتے ہیں
مگر، یہ عقدۂ فکر و نظر، کہاں کھولیں

نہ اس کے ساتھ، ہمارا بھی مول ہونے لگے
ہیں کشمکش میں، کہ مشتِ گہر کہاں کھولیں

ہوا ہے تیز، نہ اس کے ورق اڑا لیجائے
صحیفۂ نفسِ مختصر کہاں کھولیں

بچائیں آبرو، جسموں کی بھیڑ ہیں کیسے
ہے کھولنی گرہِ جاں، مگر کہاں کھولیں

کوئی فضا تو ملے ہم کو قابلِ پرواز
اب ان حدوں میں بھلا بال و پر کہاں کھولیں

ہر ایک شخص ملا مجھ سے، آسماں کی طرح
جو ساتھ ساتھ چلے اور ہم سفر نہ لگے

جو دھوپ، میرا مقدر ہے، اس کی ہم نفسو!
کسی کے سایۂ دیوار کو، خبر نہ لگے

○

کسی سے، آپ کو دعویٰ جو ہمسری کا ہے
یہ مسئلہ، وہی احساسِ کمتری کا ہے

تو ایک عکس سہی، آئنے سے باہر آ!
یہ امتحاں، تری آوارہ منظری کا ہے

جھکا لو سر کو، جو خنجر کوئی بلند کرے
اس اعتراف میں، امکان بہتری کا ہے

یہاں کوئی نہیں، ہیروں کا پوچھنے والا
خزف خزف، وہ تماشا ہنروری کا ہے

ہر اک کو فکر یہی، دوسرے کا قد ناپے
ہر ایک ہاتھ میں، پیمانہ برتری کا ہے

اسی کے ساتھ، نہ میں خود کبھی چاک ہو جاؤں
معاملہ، جو قبائے سخن وری کا ہے

شعورِ ذات بھی کیا، علم کائنات بھی کیا
ہر ایک نقش، ہماری نظر وری کا ہے

مرا کلام سمجھ کر، تو اس کو رد مت کر
یہ ایک جزو، حدیثِ پیمبری کا ہے

نئے شعور نے، کی تو شکستِ ریختہ بہت
غزل کے سر پہ ابھی تاج داوری کا ہے

درونِ بحر ہے کیا، اپنے اندروں میں اُتر
کہ تیری ذات ہی مرکز شناوری کا ہے

سجا کے جسم پہ نکلو، قبائے زخم فضا
کہ شاعری بھی تقاضا قلندری کا ہے

○

روح کے گھاؤ کو، اشعار سے بھرنا چاہوں
ہے جو دشوار، وہی کام میں کرنا چاہوں

میں ہوں گردِ رُخِ گُل، تم مجھے خوشبو کہہ لو
جمع رہنے کی تمنا میں، بکھرنا چاہوں

آسماں، اپنی بلندی سے بُلاتا ہے مجھے
کون روکے گا، جو پستی سے اُبھرنا چاہوں

تو گزرتا ہوا لمحہ ہے، مچلتا ہوا عکس
کیا ہو صورت، جو ترے پاس ٹھہرنا چاہوں

جسم تو ہے، کسی ٹوٹے ہوئے آئینے سا
پھر بھی یہ ضد، ترے پیکر سا نکھرنا چاہوں

زندگی بول! ترا اس میں زیاں ہے کتنا
کس سے پوچھوں، جو ترے عہد میں مرنا چاہوں

ہوں تو اتنا سا، مگر ذات کی وسعت کا شعور
از افق تا بہ افق، فاصلے بھرنا چاہوں

سارے منظر تو ہیں بگڑے ہوئے چہرے کی طرح
میں بھی پاگل ہوں، کہ ایسے میں سنورنا چاہوں

میں ہوں دریا کی رواں موج، تو ساحل اس کا
راستہ روک لے بڑھ کر، جو گزرنا چاہوں

ان کے خارج کی طرف یوں تو سفر ہے سب کا
میری مشکل یہ، کہ لفظوں میں اترنا چاہوں

اپنی آتش نفسی کا، ہوں فضا خود ہی حریف
لَو چراغوں کی، ہوا بن کے کترنا چاہوں

○

راستا میرا الگ، اور سفر ہے تنہا
ہیں وہ آہو، جو سرِ دشت، مفر ہے تنہا

زیب دیتا ہے یہاں، منصبِ دانش سب کو
اور نقصانِ جنوں سو مرے سر ہے تنہا

اس روایت سے، مرے عہد کی پہچان ہوئی
شہر میں بھیڑ بہت، پھر بھی بشر ہے تنہا

اک دیا اور جلاؤ، کہ اُجالا کم ہے
فکر اس کی نہیں، خورشیدِ سحر ہے تنہا

کون دے، بچھڑے ہوئے ہم سفروں کو آواز
کہیں منزل، تو کہیں راہ گزر ہے تنہا

میری روشن نفسی، غم ہیں یہ دونوں کے شریک
نہ ستارہ ہے اکیلا، نہ شرر ہے تنہا

ایک بے چہرگی، رکھتی ہے ہزاروں چہرے
عکس در عکس ہے آئینہ، نظر ہے تنہا

ہے ابھی چھاؤں گھنی میرے قلم کے نیچے
تپتے صحرا میں یہی ایک شجر ہے تنہا

کل کو، کرنا نہ پڑے ماتمِ یک شہرِ فضا
آگ کی زد میں ابھی اپنا ہی گھر ہے تنہا

کوئی سایہ، چپکے چپکے، روز اتر جاتا ہے مجھ میں
اب، حویلی پر بدن کے، دھوپ کا پہرا لگاؤں

○

گھر تلک، ہم اسے باتوں میں لگا لے آئے
جیسے مٹھی میں کوئی بھر کے، ہوا لے آئے

تم ہو گل چیں، مگر اس میں ہے ہنر ہی کتنا
ہم تو کانٹوں سے بھی کچھ رنگ اڑا لے آئے

ہے یہاں، اپنے خط و خال کی پہچان کسے
آئنہ دیکھ لیا، عکس چرا لے آئے

اب کھڑے تکتے ہیں منہ اپنا، کھنڈر کی صورت
تیرے در سے، تو مجھے لوگ اٹھا لے آئے

چلیے، زنجیر تو یوں پائے معانی کی کٹی
قیدِ الفاظ سے ہم خود کو چھڑا لے آئے

کوئی معیارِ ہُنر، وجہِ تسلّی نہ ہوا
دیکھ! کیا رنگ بہ آشوبِ انا لے آئے

اتنے بے حال نہ تھے، اہلِ قلم پہلے فضا
تم کہاں سے یہ نیا روگ لگا لے آئے

سب یہاں، اک دوسرے سے، اندر اندر کٹ چکے ہیں
دیکھنے میں، گو بہت مربوط ہے، باہر کا رشتہ

فاصلے، میں ناپنا چاہوں، مکان و لامکاں کے
جوڑ دے، اپنی ہواؤں سے، مرے شہپر کا رشتہ

○

آگ میں پھول کھلائے رکھو
خود کو گل زار بنائے رکھو

میں ہوں منزل، مجھے پانا کیا دور
راستو! پاؤں جمائے رکھو

عیش ہے دھوپ، جھلس جاؤ گے
ساتھ کچھ درد کے سائے رکھو

زد پہ ہو میری سیہ روزی کے
کا جلو! آنکھ چُرائے رکھو

گھر میں بھی، کتنے سفر ہیں درپیش
گرد، چہرے پہ سجائے رکھو

ہیں تمھارے ہی بدن کی خوشبو
ہم کو کپڑوں میں بسائے رکھو

میں جو بجھ جاؤں گا، کام آئیں گے
کچھ چراغ اور جلائے رکھو

وہ خواب کو موت کہہ رہا تھا
میں، موت کو خواب لکھ رہا ہوں

بال اب سفید ہو رہے ہیں
ماضی کا حساب لکھ رہا ہوں

○

تھی دشت دشت وہ ساعت، جو رہ کے گھر میں کٹی
تمام عمر، بھٹکتے ہوئے سفر میں کٹی

قدم جمے رہے، بیدرد فاصلوں کے بیچ
جو رات کٹنی تھی منزل پہ، رہ گزر میں کٹی

ستم کش، اپنے ہی یارانِ تیز دست کا ہوں
مری زبان، اسی بزمِ معتبر میں کٹی

فریب نکلا، حقیقی لہو کا رشتہ بھی
یہ کیسی نوکِ سناں تھی، جو دل جگر میں کٹی

وہ میرے ساتھ، فقط ابتدائے شب میں رہا
کہ پچھلی رات تو، اندیشۂ سحر میں کٹی

ملی وہ چشمِ خود آرا، کہ عمرِ خوش نظری
تمام، معرکۂ منظر و نظر میں کٹی

نہ ہوتے فن کے محافظ اگر، تو کیوں لٹتے
صدف کی جیب، نگہداریِ گہر میں کٹی

فضاؔ نہ پوچھو! کہ گزری ہے زندگی کیسے
ہُنر کی دین تھی، آرائشِ ہُنر میں کٹی

اس نگر میں تو، ہر اک شخص خدا لگتا ہے
یہ کہاں آ گئے ہم، بت شکنوں کے پیچھے

کوئی، حالات کے تیور کو، نہ پہچان سکا
قافلے چلتے رہے، راہزنوں کے پیچھے

○

حرف و الفاظ و معانی کے حجابوں میں نہ تھی
بات چہروں پر جو لکھی تھی، کتابوں میں نہ تھی

میری شوخیِ تعلق سے جو چاہے فیض اٹھائے
تھی مرے انفاس میں خوشبو، گلابوں میں نہ تھی

میں تھا اپنے عہد کی سچائیوں کا وہ سوال
جس کو رد کرنے کی گنجائش جوابوں میں نہ تھی

وہ حقائق بیں نظر ہی اب نہیں، ورنہ یہاں
صورتِ بے چہرگی، کن کن نقابوں میں نہ تھی

اب ہوا معلوم، تیرے شہر سے ہجرت کے بعد
کیا خرابی تھی، جو ہم خانہ خرابوں میں نہ تھی

تم نہ سمجھو گے، وہ سب میرے لہو کا کرب تھا
کوئی اپنے نام کی مستی، شرابوں میں نہ تھی

انگلیوں کی یہ جراحت، یہ قلم کی خستگی
کب ہماری زندگی ایسے عذابوں میں نہ تھی

کر رہا ہوں، کاروبارِ شعر میں اپنے کو خرچ
ورنہ ایسی مد کوئی، گھر کے حسابوں میں نہ تھی

یہ بھی شعری تجربوں کا اک تسلسل ہے نصاؔ
اب غزل جیسی ہے، وہ کتنوں کے خوابوں میں نہ تھی

○

پھول تو کیا توڑتا، خوشبو چُرا کر لے گیا
وہ مجھے بھی، میری نظروں سے چھپا کر لے گیا

سب کو، کرنا ہے یہاں پر اپنا اپنا احتساب
کون، کس کا بوجھ کاندھے پر اٹھا کر لے گیا

کیا مرے لب کا تبسّم، راستے کی گرد تھا
درد کا جھونکا اُسے آخر اُڑا کر لے گیا

راہزن نکلا وہی، جو مدتوں کا تھا رفیق
کُل اثاثہ، جسم کی دیوار ڈھا کر لے گیا

مان لے گی اب اُسے دُنیا، نظر والا کہ وہ
اپنے چہرے پر مری آنکھیں سجا کر لے گیا

ذہن کی دہلیز، عمرِ رفتہ کے قدموں کی چاپ
مجھ کو اُس تک، نیند میں کوئی جگا کر لے گیا

ذوقِ آشوبِ ہنر ہے، ایک تیغِ بے نیام
کون اس مقتل سے، اپنا سر بچا کر لے گیا

تلخ اتنا کب تھا، شعر و آگہی کا ذائقہ
تجربوں کا زہر ہیں اس میں ملا کر لے گیا

جاگتی آنکھوں سے، چکھو، ٹوٹتے خوابوں کا زہر
کیا کرو گے، وہ یہ دولت بھی جو آ کر لے گیا

راکھ کی تہ میں، شرارے کی طرح زندہ تھا میں
وہ یہ سمجھا، وقت شعلے کو بجھا کر لے گیا

گم رہے، تہذیبِ روحِ شعر میں ہم اے فضاؔ
انجمن سے داد، وہ غزلیں سنا کر لے گیا

ذہن کی دہلیز، عمرِ رفتہ کے قدموں کی چاپ
مجھ کو اُس تک، نیند میں کوئی جگا کر لے گیا

ذوقِ آشوبِ ہنر ہے، ایک تیغِ بے نیام
کون اس مقتل سے، اپنا سر بچا کر لے گیا

تلخ اتنا کب تھا، شعر و آگہی کا ذائقہ
تجربوں کا زہر میں اس میں ملا کر لے گیا

جاگتی آنکھوں سے، چکھو، ٹوٹتے خوابوں کا زہر
کیا کرو گے، وہ یہ دولت بھی جو آ کر لے گیا

راکھ کی تہ میں، شرارے کی طرح زندہ تھا میں
وہ یہ سمجھا، وقت شعلے کو بجھا کر لے گیا

گم رہے، تہذیبِ روحِ شعر میں ہم اے فضا
انجمن سے داد، وہ غزلیں سنا کر لے گیا

تخلیق کے شعور کا پیکر دکھائی دوں
خود کو تراشتا ہوں کہ آ زر دکھائی دوں

تیشے کے لمس سے م ن ہستی ہے تابناک
آئینہ میں نہیں کہ مکدر دکھائی دوں

مجھ کو یہ ذوق، باطنِ دریا میں ڈوب جاؤں
اُس کو یہ شوق، سطح کے اوپر دکھائی دوں

باندھا ہے، میرے ذوقِ انا نے، یہ کیا طلسم
قطرہ ہوں، اور سب کو سمندر دکھائی دوں

ہے درمیاں میں، خود شکنی کا معاملہ
ایمان تجھ پہ لاؤں، تو کافر دکھائی دوں

محفل میں تیری بیٹھوں، تو اربابِ رشک کو
تپتے ہوئے سراب کے اندر دکھائی دوں

میرے وجود پر ہے کن اسرار کا غلاف
شاعر دکھائی دوں نہ پیمبر دکھائی دوں

دعویٰ تو ہمسری کا کسی سے نہیں، مگر
جو دیکھے۔ اُس کے قد کے برابر دکھائی دوں

یہ بھی نہیں، کہ ہوں کوئی فردوسِ گم شدہ
تم دیکھنا نہ چاہو، تو کیوں کر دکھائی دوں

کس درجہ، طرزِ فکر میں ٹھہراؤ آگیا
مقصد یہ تھا، کہ وقت کا محور دکھائی دوں

دو مجھ کو اور کچھ، نہ قلم کی جراحتو!
اتنا تو ہو، لہو کا شناور دکھائی دوں

○

کہوں نہ کچھ، تو ہلاکِ فغاں نظر آؤں
جب اُس سے بات کروں، بے زباں نظر آؤں

ترے خلوص نے، پہنچا دیا کہاں مجھ کو
کسی زمیں پہ رہوں، آسماں نظر آؤں

گلہ ہو کیا، یہ زمانے کی ریت ہے پیارے
چراغ سب کے جلاؤں، دھواں نظر آؤں

کسی صلیب پہ سو جاؤں، یہ تو ممکن ہے
نہیں قبول، ہُنر کا زیاں نظر آؤں

رواں خود اپنے تعاقب میں اس ترنگ سے ہوں
کہ دشت دشت، رمِ آہواں نظر آؤں

عجب نہیں ہے، جو دانش ورانِ شہر کو میں
ز فرق تا بہ قدم، خارِ جاں نظر آؤں

شعور و فکر کا مرکز رہا ہوں، صدیوں سے
چلوں اکیلے، مگر کارواں نظر آؤں

جو، کائنات کے اسرار بھی کروں دریافت
شعورِ ذات کا بھی ترجماں نظر آؤں

جو کھا سکا نہ کلیجے پہ تیر، اُسے بھی رہا
یہ حوصلہ، کہ کڑکتی کماں نظر آؤں

اُجڑ چکا ہوں، یہ مجھ سے مطالبہ نہ کرو
کہ خون اُگلوں، شفق کی دکاں نظر آؤں

قضا یہ آگ، مری ذات کا مقدر تھی
قلم جو پکڑوں، تو دشتِ تپاں نظر آؤں

کہیں اُتار کے پھینک آئیں ہم انھیں لوگو!
ہمارے جسم، جو پیراہنِ شرر ہیں ابھی

یہ زنگ، جو ہر دانش کو چاٹ جائے گا
مرے لغت میں کچھ الفاظ معتبر ہیں ابھی

جلاؤ آتشِ جاں، یہ جمود تو ٹوٹے
کہ یخ زدہ سے، رفیقانِ دیدہ ور ہیں ابھی

ذرا یہ دھوپ ڈھلے تو، حواس میں آئیں
سلگتی سوچ میں ڈوبے ہوئے شجر ہیں ابھی

شعور، کوئی نئی راہ ڈھونڈھ ہی لے گا
کہ تجربوں کے قدم شمعِ رہ گزر ہیں ابھی

مجھے یقیں ہے فضاؔ! ان کو جھیل جاؤں گا
وہ حادثے، جو پسِ دانش و نظر ہیں ابھی

اُداس دیکھ کے، وجہِ ملال پوچھے گا
وہ مہرباں نہیں ایسا، کہ حال پوچھے گا

جواب دے نہ سکو گے پلٹ کے، ماضی کو
اک ایک لمحہ وہ چُبھتے سوال پوچھے گا

دلوں کے زخم، دہن میں زباں نہیں رکھتے
تو کس سے ذائقۂ اندمال پوچھے گا

کبھی تو لا کے، ملا مجھ سے، میرے قاتل کو
جو سر ہے دوش پہ تیرے وبال، پوچھے گا

یہ کیا خبر تھی، کہ سینے کے داغ لَو دیں گے
کوئی جو محنتِ فن کا مآل پوچھے گا

تو حرفِ عشق و بصیرت ہے، لب نہ سی اپنے
زمانہ تجھ سے بھی تیرا خیال پوچھے گا

مجھے تراش کے رکھ لو، کہ آنے والا وقت
خزف دکھا کے، گہر کی مثال پوچھے گا

بنا کے پھول کی خوشبو، بکھرائے گی صدیوں
ہوا سے کون، رہِ اعتدال پوچھے گا

یہ ایک پل، جو ہے مجہول شخص کی صورت
مزاجِ آگہیِ ماہ و سال پوچھے گا

یہاں تعیُّنِ اقدار بھی ضروری ہے
خود اپنے مشک کی قیمت غزال پوچھے گا

مرا قلم، ابدیّت کی روشنی ہے فضا
اس آفتاب کو، اب کیا زوال پوچھے گا

سوزِ جاں ہے یہ مرے جسم کے اندر کیسا
ریت کی تہہ میں، سلگتا ہے سمندر کیسا

میٹھی میٹھی سی یہ تلخی ہے زباں پر کیسی
ہلکا ہلکا سا یہ اک بوجھ ہے دل پر کیسا

تھی یہی مست ہوا، پھول کھلانے والی
رکھ دیا اس نے، چراغوں کو بجھا کر کیسا

دھوپ ہے کتنی کڑی، گھر سے نکل کر دیکھو
روپ موسم نے بدل رکھا ہے باہر کیسا

اپنے ہی ذہن کے تاریک خلا میں گم ہے
راہ بھولا ہے بصیرت کا شناور کیسا

ہے سوا نیزے پہ آیا ہوا سُورج ہر شخص
ابر سا، پھر بھی ہے ماحول کے اوپر کیسا

خال و خط دھوپ میں جُھلسے ہوئے بھیگی آنکھیں
دشتِ بے آب ہے دریا کے برابر کیسا

کس طرح قید سے اب وقت کی باہر نکلوں
لے اڑا کاٹ کے، لمحوں کے وہ شہپر کیسا

آج بھی جذبۂ تخلیق کی ہے پیاس وہی
متحیر ہوں، کہ ڈھالے کوئی پیکر کیسا

کم نہیں سطوتِ خسرو سے، قلم کا پندار
یہ تہی دست بھی، لگتا ہے تونگر کیسا

○

ہر اک قیاس، حقیقت سے دور تر نکلا
کتاب کا نہ کوئی درس معتبر نکلا

نفس تمام ہوا، داستان ختم ہوئی
جو تھا طویل، وہی حرف مختصر نکلا

جو گرد ساتھ نہ اُڑتی، سفر نہ یوں کٹتا
غبارِ راہ گزر، موجِ بال و پر نکلا

مجھے بھی کچھ نئے تیشے سنبھالنے ہی پڑے
پُرانے خول کو جب وہ بھی توڑ کر نکلا

فضا کشادہ نہیں قتل گاہ کی، یہ کہاں
مرے لہو کا پرندہ، اڑان پر نکلا

وہ آدمی، کہ جو محمل تھا آفتابوں کا
بہ قدرِ یک دو کفِ خاکِ رہ گزر نکلا

یہ رات جس کے لئے میں نے جاگ کر کاٹی
ملا وہ شخص، تو خوابوں کا ہم سفر نکلا

اُڑھا دی چادرِ عصمت اُسے خیالوں نے
ہر ایک لفظ زباں سے، برہنہ سر نکلا

فضا! تم الجھے رہے، فکر و فلسفہ میں یہاں
بہ نامِ عشق، وہاں قرعۂ ہنر نکلا

تیری ہی موجیں ہیں، تیرے پاؤں کی زنجیر کب سے
... نکل آ!

○

رُتوں کے سوگ میں تصویرِ درد ہوجاؤں
جو پھولے کھیت میں سرسوں، تو زرد ہوجاؤں

یہ آنچ کچھ تو بدن کو، تپائے رکھتی ہے
دکھوں کی دھوپ نہ کھاؤں، تو سرد ہوجاؤں

شعورِ دیدہ وری ! تجھ پہ قرض ہے میرا
جنون وہ دے، کہ حقائق نورد ہوجاؤں

یہ کیا طلسم ہے ! دن میں رہوں چراغاں سا
جب آئے رات تو میں گرد گرد ہوجاؤں

شکستگی ہی فضا ہے، یہاں نظامِ حیات
جو خود کو جمع کروں، فرد فرد ہو جاؤں

O

شوخ و شنگ انا میرا، جو مری بصیرت کا حُسن بھی ہے خامی بھی
شاعری کی دنیا میں، ہے اسی کی پروردہ ۔ وضعِ خود کلامی بھی

نیکیوں سے کیا حاصل، جاؤ ان کو دریا میں، اب اُٹھا کے پھینک آ ؤ
دامنِ دل و جاں کا، بن گئی ہے اک دھبّہ، اپنی نیک نامی بھی

اقتدارِ ذاتی کے، بُت تراشے جاتے ہیں، اور پوجے جاتے ہیں
شہرِ میر و منعم کا، ایک آزرستاں ہے، مجلسِ عوامی بھی

سونے اور چاندی کی، پاؤں میں ہیں زنجیریں، تیز چل نہیں سکتے
لذتِ تن آسانی، کچھ بُری نہیں لیکن، یہ سبک خرامی بھی

مُہر ہے زبانوں پر، بندشیں خیالوں پر، قدغنیں ضمیروں پر
پھر بھی ہم سمجھتے ہیں، اک عظیم منصب ہے، وقت کی غلامی بھی

لاؤ میرے ساغر میں، ڈھال دو اسے یارو! میں یہ آگ پی جاؤں
کب سے خاک بر سر ہے، دانش و بصیرت کا، شعلۂ گرامی بھی

روح زہر آلودہ، ذہن کرب آلودہ، فن خراشش آلودہ
دیکھ! قُلزم خوں میں، کیسے غسل دیتی ہے، شہرتِ دوامی بھی

اپنی اپنی کرچیاں، چُنتے رہے سب
زندگی بکھری بہت، جینے سے میرے

یہ شفق، یہ مہر و مہ کیا چیز، ورنہ
آسماں اونچا نہ تھا، نیزے سے میرے

○

میراثِ فکر و دولتِ فن ۔ بانٹتے چلیں
اہلِ سخن، متاعِ سخن بانٹتے چلیں

رکھنا ہے اپنے شہر کے چارہ گروں کی لاج
کہہ کر گلاب، زخمِ بدن بانٹتے چلیں

منزل پہ جب رُکیں، تو کریں اُس کا کچھ حساب
رستوں کو، کیا سفر کی تھکن بانٹتے چلیں

رکھّے گی خوش مزہ انھیں، مفہوم کی خلش
لفظوں کو، ہلکی ہلکی چُبھن بانٹتے چلیں

ہیں دشتِ شب میں، ہم تو فضا چاند کی طرح
خود ظلمتیں سمیٹیں، کرن بانٹتے چلیں

○

زندگی کے جنوں خیز ایام میں، فرصتوں کے میسر ہیں لمحات کم
کچھ دنوں سے تو اب اپنے ہی آپ سے، دوستو ہو رہی ہے ملاقات کم

گردشِ وقت کے سرد آغوش میں، زندگی تھک گئی، جاگتے جاگتے
کوئی خوابوں کی سرحد سے آواز دے، رہ گئی ہے گزرتی ہوئی رات کم

اپنی گُل زار پلکوں پہ کس چاؤ سے، میرے آنسو سجا کر کوئی لے گیا
شہر کے لوگ یہ سوچتے ہیں، ہوئی اب کے موسم میں شاید کہ برسات کم

سچ جو پوچھو، تو جینے کی سچی خوشی، کمتری کے اس احساس نے چھین لی
برتری کا یہ پندار مٹتا نہیں، میرا رتبہ بڑا، اس کی اوقات کم

اس کے بس میں نہیں، چاند کی سطح کو چھو کے بھی یہ بلند آشیاں بن سکے
باخبر دور کا باوقار آدمی، ذہن رکھتا ہے قد سے بھی دو ہاتھ کم

کن تضادوں کا سنگم ہے دنیا مری، جسم سمٹا ہوا، ذہن بکھرا ہوا
آج وہ بھی اسی بھیڑ میں گم ملے، جن کو تھا اعتبارِ غمِ ذات کم

کون جانے کس آہنگ میں دب گئیں، ساری ابلاغ و ترسیل کی قوتیں
یہ معمہ بھی ناقابلِ فہم ہے، ڈھیر سارے ہیں الفاظ، اور بات کم

فلسفے کی نقابوں سے بھی شعریت، حُسن و رومان بن کر جھلکتی رہی
میرے اربابِ فکر و نظر نے یہاں کی تو ویسے نہ تہذیبِ جذبات کم

دیر سے، چپ ہیں جو ماجرا ساز تھے، مصلحت بولنے کی اجازت بھی دے
اعتراف و ستائش کے اس دور میں، ہے زبانوں پہ تنقیدِ حالات کم

دھوپ کی آنچ کھا کر نکھرتے رہو، سہہ کے کانٹوں کا دکھ مسکراتے رہو
ہم سلگتے گلابوں کی تقدیر میں ہیں شکستیں زیادہ، فتوحات کم

کیا خبر تھی، کہ اُس کوچۂ ناز کی خاکِ گلگوں بھی اتنی کم آمیز ہے
لوگ حیرت سے تکتے ہیں میری طرف، ہے جو رُخ پر غبارِ مدارات کم

اب کدھر جائیں ہم صاحبانِ نظر، لے کر اپنی بساطِ علوم و ہنر
کون ایسے میں کچھ فیصلہ کر سکے۔ روشنی کم، نہ آشوبِ ظلمات کم

لطفِ وجدان ہو تو اسی خاک سے، آج بھی شعر و دانش کی فصلیں اگیں
ذہن ہر چند ہیں شورزاروں میں گم، اور نشو و نمائے خیالات کم

اپنے ابریشمیں وضع و انداز سے، کتنی مانوس آخر ہے صنفِ غزل
تجربوں کی تپش حد سے افزوں ہوئی، پھر بھی پگھلی ہے برفِ روایات کم

پڑھ کے خط، سوچتا ہوں کہ پہلے فضا اس کی تحریر میں اتنی شدت نہ تھی
تلخ لہجوں کے تحفے بہت ہیں مگر، شہد میں ڈوبے لفظوں کی سوغات کم

ہم اہلِ فن بھی ہیں، ریشم کے خالقوں کی طرح
کہ جس طلسم سے نکلے، اسی میں ڈوب گئے

○

خلافِ طبعِ رفیقاں، بیان کیا کرتا
تھی میرے مُنہ میں اُنھیں کی زبان، کیا کرتا

زمیں قریب تھی، میرا نہ کچھ بگاڑ سکی
جو مجھ سے دور تھا، وہ آسمان کیا کرتا

شکستِ ذات سے، کچھ میں بھی خوش نہیں لیکن
پڑی تھی سخت جھمیلوں میں جان، کیا کرتا

یہ دشتِ قلب و نظر، یہ تمازتوں کا پڑاؤ
بنا کے جسم کو میں سائبان، کیا کرتا

خود اپنے آپ کا بننا پڑا ہدف آخر
نفس نفس تھا کڑکتی کمان، کیا کرتا

مرا ضمیر، کبھی مصلحت پرست نہ تھا
تری ہوس تھی مگر درمیان، کیا کرتا

شکستگی کا سبب، اپنی بُردباری تھی
نہ ٹوٹتا میں، تو تیشہ گمان کیا کرتا

نہ پوچھیے کہ بدن کیسے پڑ گیا نیلا
اُتارنا تھی سفر کی تکان، کیا کرتا

حدودِ وقت میں خود کو سمیٹے بیٹھا ہوں
جسے بکھرنے کا ڈر ہو، اُڑان کیا کرتا

ہوں آپ اپنی گرفتِ شعور سے آزاد
بچھا کے دام، مرا ترجمان، کیا کرتا

یہی قلم، مرے حق میں صلیب بھی ہے نفاؔ
زمانہ اور مرا امتحان کیا کرتا

شہرتوں کی منڈی ہیں، لوگ خود ہی بکتے ہیں اور دکاں لگاتے ہیں
ہیں کہ ایک شاعر ہوں، دیکھ میری قیمت کیا نکتہ داں لگاتے ہیں

پہلے ہم کو حل کرلو۔ زندگی کی باریکی، پھر سمجھ میں آئے گی
اپنی ذات کے اوپر، حل طلب مسائل کا ہم نشاں لگاتے ہیں

اتنی پیش بینی بھی، اصل میں ہے کج بینی، فیصلہ ہے دنیا کا
لوگ کتنے پاگل ہیں۔ دھوپ جب نہیں ہوتی۔ سائباں لگاتے ہیں

جو گھٹن ہے اندر کی۔ روشنی ہوا پا کر۔ تازگی میں بدلے گی
اس خیال سے ہم بھی۔ اپنے بند ذہنوں میں کھڑکیاں لگاتے ہیں

تو سہی بہت شاطر، تیری آنکھ کا کاجل، نیند میں چرالیں گے
ہم ہیں ایسے فرزانے۔ جو ہوا کے پیروں میں مہندیاں لگاتے ہیں

دریچۂ نسیم سمن

حسرتِ فلک بازی، آدمی کے سینے میں، پر جھٹکتی رہتی ہے
ہم زمیں پہ رہتے ہیں، اور گھر کے روزن میں آسماں لگاتے ہیں

اور بھی نکھرتا ہے، ذوقِ آبرومندی، اعتبارِ خوش وضعی
میں اسی قدر خوش ہوں، مجھ پہ جس قدر تہمت دوستاں لگاتے ہیں

دُھند کا ہیولا ہیں، تیز روشنی ان کو، راس آ نہیں سکتی
رُخ پہ یہ چراغوں کے، اپنی نابصیری کا خود دھواں لگاتے ہیں

خوشبوؤں کے پنچھی کو، ہم کسی بھی پنجرے میں، قید رکھ نہیں سکتے
سادہ لوحیاں دیکھو، لوگ عقل کے پیچھے، پاسباں لگاتے ہیں

ہم فقیر ہیں تیرے، تو ہمارے جملوں کو، کچھ معانی پہنا دے
روز طنز کیوں سنیے، جو صدا لگاتے ہیں، رائگاں لگاتے ہیں

ماہرِ سیاست ہیں، ہے انھیں خبر اس کی، یہ طلسم جھوٹا ہے
پھر بھی اپنی کشتی پر، عنکبوتی ریشوں کے، بادباں لگاتے ہیں

رنگ بول پڑتے ہیں، خوشبوئیں کھنکتی ہیں۔ ساز و ارغنوں جیسے
نقش بے صدا ہیں جو۔ ان کے منہ میں جذبوں کی۔ ہم زباں لگاتے ہیں

ہم ہیں صاحبانِ فن ، سوجتن سے کرتے ہیں، اپنے فن کی آرائش
ایک ایک مصرع پر، رنگِ لب چھڑکتے ہیں، عطرِ جاں لگاتے ہیں

یہ آسمان تو، اُتری ہوئی کمان سا ہے
مری زمین ہے، پیمانۂ انا میرا

تری گرفتِ سخن میں، کبھی نہ آئے گا
ہوا کی موج ہے، حرفِ گریز پا میرا

○

کل شب، وہ ہم نشیں جو مرا ہم پیالہ تھا
دونوں جہاں کا عیش، سبو کا فضالہ تھا

لکھتا رہا میں اس کا سراپا تمام رات
جیسے وہ خود بھی میرے قلم کے حوالہ تھا

ہر شخص اپنی ذات کے معبد میں گم رہا
کیا آگہیِ عصر بھی منہ کا نوالہ تھا

پوچھیں، کبھی ملیں جو وہ شوریدہ طبع لوگ
کس کا لہو، چراغِ گزرگاہ لالہ تھا

پڑھتے پڑھاتے کٹ گئی جس کی تمام عمر
اس کا بدن بھی کتنا شگفتہ مقالہ تھا

سورج سمجھ کے، لوگ مجھے پوجتے رہے
یہ کیسی روشنی کا مرے گرد ہالہ تھا

اتنے سلیقہ مند کہاں کے تھے ہم فضا
مقصودِ شاعری سے دکھوں کا ازالہ تھا

توڑ کر آئینوں کو، چرا لے گیا سارے عکس
کچھ تو اس کا پتہ دو، کہ وہ خودنگر کون تھا؟

زندگی بیں ہیں، اس کے سوا، مسئلے اور بھی

اک عہد ساز طرزِ سخن چاہیئے ہمیں
غالب سی کج کلاہیِ فن چاہیئے ہمیں

وہ گُل ہو یا شرر، کسی پیکر میں ڈھال دے
ہم ہیں بھٹکتی روح، بدن چاہیئے ہمیں

سو آفتاب، پھر بھی وہی قحطِ روشنی
ہر صبح، اک لہو کی کرن چاہیئے ہمیں

تنہا ہمیں ہیں بس، تری نعمت کے قدرداں
کھانے کو زہر، کام و دہن چاہیئے ہمیں

آشوبِ روزگار سے ٹھہرا ہے واسطہ
اک عزمِ روزگار شکن چاہیئے ہمیں

غربت میں کون، طعنِ تہی دامنی سُنے
تھوڑی سی اور خاکِ وطن چاہیئے ہمیں

پھرتے ہیں بوئے گُل سا بدن لے کے، بے لباس
پیراہنِ نسیمِ چمن چاہیے ہمیں

یاں کون بارِ لفظ و معانی اُٹھائے گا
اپنی ہی سمت، روئے سخن چاہیے ہمیں

ہر چند جاں گداز ہوں حالات اے نفسؔ
موضوعِ فکر، سرو و سمن چاہیئے ہمیں

اب، مجھ پر اٹھا لو اپنی دیوار
پتھر کی اساس ہو گیا ہوں

○

جبیں پہ گرد ہے، چہرہ خراش میں ڈوبا
ہوا خراب، جو اپنی تلاش میں ڈوبا

قلم اٹھایا، تو سر پر کلاہ کج نہ رہی
یہ شہر یار بھی، فکرِ معاش میں ڈوبا

جھلے ہے پنکھا، یہ زخموں پہ کون آٹھ پہر
ملا ہے مجھ کو نفس، ارتعاش میں ڈوبا

اُسے نہ کیوں، تری دلدارئ نظر کہیے
وہ نیشتر، جو دلِ پاش پاش میں ڈوبا

فضا ہے خالقِ صبحِ حیات، پھر بھی غریب
کہاں کہاں نہ افق کی تلاش میں ڈوبا

کچھ تازہ موسموں کے بھی منظر لیے پھروں
کاندھے پہ اپنے، جلتا ہوا گھر لیے پھروں

باہر نہ کیوں اچھال دوں اندر کے سارے کرب
کوزے ہیں کب تلک، یہ سمندر لیے پھروں

چشم و نگاہ میں، وہی اب بھی ہیں فاصلے
کن مدرسوں میں دانش و دفتر لیے پھروں

سب جانتے ہیں کیا ہے مری بات کا جواب
کیوں، لب پہ کوئی حرفِ مکرر لیے پھروں

اس آئینے کو اب کسی پتھر پہ توڑ دے
کس آسرے پہ تہمتِ جوہر لیے پھروں

ہمت نہیں، کہ وقت کی تہ میں اتر سکوں
قطروں کے درمیان، شناور لیے پھروں

جز شوق، مدعائے سفر اور کچھ نہیں
بے نام منزلوں کو، سفر پر لیے پھروں

مانا، نہیں بدن پہ ذرا سی خراش تک
میں کتنے گھاؤ، روح کے اندر لیے پھروں

ماحول کا جمود نہ کر دے بدن کو سرد
اک شعلہ، اپنے قد کے برابر لیے پھروں

صندل نہیں، کہ سانپ سے رکھوں معاملہ
ورنہ تجھے بھی ساتھ، ستم گر لیے پھروں

ناقدریوں کا درد چھپائے ہوئے فضاؔ
فن کار کے قلم کا مق

دشوار آج بھی ہے اجالوں کی بازیافت
اب بھی نظر ورانِ سحر راستے میں ہیں

چہرے پہ گرد بن کے جمی پاؤں کی تھکن
کھولیں کہاں یہ رختِ سفر، راستے میں ہیں

آگے بڑھو! کہ ہم سفروں کو ہے انتظار
دانش ورانِ بزمِ ہنر راستے میں ہیں

بھر لو ہمیں جو لفظوں کی مٹھی میں بھر سکو
معنی کی خاکِ پا ہیں، مگر راستے میں ہیں

نکلے تو ہو چراغ بہ بکف، گھر سے اے فضاؔ
بے رحم آندھیوں کے نگر راستے میں ہیں

کیسے، آشوبِ دانش پہ رکھتا نظر، میں کم آگاہ تھا
دے گیا کوئی، آنکھوں کے بدلے مجھے، بے بصر آئینے

لے کر متاعِ علم و خبر، راستے میں ہیں
منزل ہے چپ، کہ اہلِ نظر راستے میں ہیں

تنہا نہیں ہیں لوگ، کہ یادیں ہیں ہم سفر
بیتے ہوئے دنوں کے کھنڈر راستے میں ہیں

تپتے سراب، اڑتے بگولے، بکھرتے خواب
[illegible] کتنے [illegible] راستے میں ہیں

○

جینے کے اہتمام میں، مرنا پڑا اسے
سو بار، موجِ خوں سے گزرنا پڑا اسے

اپنے کو جمع رکھنے کی کوشش فضول تھی
یوں ہے، کہ سانس سانس بکھرنا پڑا اسے

آخر، زمیں سے ہار گیا آسمان بھی
اپنی بلندیوں سے اترنا پڑا اسے

مشکل بہت تھا، وادیِ احساس کا سفر
زخموں پہ رکھ کے پاؤں، گزرنا پڑا اسے

دل بجھ گیا، تو دیدۂ بینا کے باوجود
اپنی ہی روشنی سے مکرنا پڑا اسے

یہ فکر تھی، رگوں میں لہو جم کے رہ نہ جائے
شعلوں کے درمیان، ٹھہرنا پڑا اسے

ہر ایک شخص، وقت پہ نظریں بدل گیا
دل کے خلا کو، درد سے بھرنا پڑا اسے

چہرے کی گرد، خندۂ لب سے نہ دُھل سکی
اشکوں کے آئینے میں سنورنا پڑا اسے

میں نے صدا شعورِ غزل کو جو دی فضاؔ
جذبے کے اندروں سے ابھرنا پڑا اسے

اس آئینے ہی میں، لوگوں نے خود کو پہچانا
بھلا ہوا، کہ میں چہروں کے درمیان گرا

○

خیر، وہ ہے جیسا بھی، ہے تو آشنا پھر بھی
بے رفاقتی ٹھہری ایک واسطا پھر بھی

وہ جو اپنا چہرہ تھا، گرد ہو چکا کب کا
عکس عکس پھرتا ہوں لے کر آئنا پھر بھی

میں نے اپنے لہجے کی آنچ سونپ دی تجھ کو
کیوں ہیں تیری محفل کے رنگ بے صدا پھر بھی

کائنات کے اندر کم نہیں تھی گہرائی
اپنی ذات کے اندر، ڈوبنا پڑا پھر بھی

گو، کہ اس کی باتیں ہیں جھیل کے کنول جیسی
لفظ لفظ مہکا ہے شعلۂ نوا پھر بھی

اپنے ہی لہو نے گو، اس کی پرورش کی ہے
ایک اک تبسم ہے، زخمِ حادثہ پھر بھی

ہر قدم پہ حائل ہیں، نقشِ پا کی دیواریں
میرے ساتھ چلتا ہے، کیسے راستا پھر بھی

پتھروں کی دنیا میں پھول بن کے جی لیں گے
زندگی! تری خاطر کم ہے یہ سزا پھر بھی

کر لیے تھے ہم سب نے، گوشت سے جدا ناخن
زندگی کے چہرے کا، خول اتر گیا پھر بھی

تم شعورِ ماضی کے آئینے کچل ڈالو!
ہے نئی بصیرت کو اپنا سامنا پھر بھی

کچھ بہ صورتِ تحفہ، قاتلوں کو لوٹا دو
قدر میں نہ کم ہوگا، میرا خوں بہا پھر بھی

سرخرو انھیں سے ہے، حسرتِ جگر کاوی
ناخنوں کو کیوں کہیے، تیشۂ حنا پھر بھی

میں نے قتل کر ڈالا اپنے آپ کو لیکن
مجھ میں سانس لیتا ہے کوئی دوسرا پھر بھی

عشق اور سرمستی، ہیں غزل کی تہذیبیں
مجھ کو باوجود اس کے، پاسِ وضع تھا پھر بھی

مصلحت کی سوزن سے ہونٹ سی لیے ہم نے
بزم بزم جلتی ہے شمعِ ماجرا پھر بھی

وقت نے فضا مجھ کو راکھ کر دیا، لیکن
ذہن ذہن جلتا ہوں اک چراغ سا پھر بھی

ایسا نہیں، کہ طرزِ کہن دھیان میں نہ تھی
تقلیدِ رفتگاں، مرے امکان میں نہ تھی

ہم پر کھلا یہ راز، کئی ہجرتوں کے بعد
گھر میں جو خاک تھی، وہ بیابان میں نہ تھی

آنگن میں ہے، دھوئیں کا یہ روشن غبار کیا
روشن تو کوئی شمع بھی، دالان میں نہ تھی

بے چہرگی کی دُھند تھی گہری، وگرنہ یوں
مشکل کوئی، مری تری پہچان میں نہ تھی

کیا شے ہے ذوقِ معرفت [illegible]

شعورِ ذات کی پہنائیوں میں گم اب کے
میں خود ہوں، اپنی خود آرائیوں میں گم اب کے

مری زمیں پہ، یہ افتاد کیسی آن پڑی
کہ آسماں بھی ہے، پسپائیوں میں گم اب کے

ہر آدمی ہے ہیولا خود اپنے خوابوں کا
حقیقتیں ہوئیں پرچھائیوں میں گم اب کے

کہاں پہنچ کے، یہ آشوبِ ذات ساتھ لگا
کہ فرد فرد ہے تنہائیوں میں گم اب کے

جو میں قبائے معانی ہوں، چاک کر مجھ کو
ہوں اپنے لفظوں کی گہرائیوں میں گم اب کے

کہاں سے ان کو ملی۔ میری دُکھ بھری آواز
یہ کیسا درد ہے شہنائیوں میں گم اب کے

اسے ہوس تھی فضا تجھ سے داد پانے کی
مرا قلم ہوا رُسوائیوں میں گم اب کے

کہاں، ہر ایک شناور گہر بہ کف نکلا
سمندروں سے توقع نہ اس قدر باندھو

یہی شعور، معانی کا ذائقہ دے گا
قلم کی شاخ سے، الفاظ کے ثمر باندھو

مِرے لہو کی طراوت، کوئی چرائے کیا
یہ اوس بھی تری کرنوں کے ہاتھ آئے کیا

نہ اُترے رُوح میں جنبک خود اپنی ذات کا کرب
یہ تجربوں کی کسک ذہن کو جگائے کیا

ہوا پسینے پسینے ، بدن معانی کا
مری طرح کوئی لفظوں کی آنچ کھائے کیا

سلگ سلگ کے، تو یادوں کا جسم راکھ ہوا
مجھے کرید کے دیکھے بھی وہ، تو پائے کیا

جہاں شجر تھے ، قطاریں ہیں اب صلیبوں کی
اب اس نواح میں خیمہ کوئی لگائے کیا

دریچۂ سیم سمن

کھڑا ہوں بارشِ سوفار و سنگ میں بے خوف
گلو بریدہ جو ٹھہرا، وہ سر بچائے کیا

متاعِ جاں تو کہاں، دولتِ زیاں بھی نہیں
سمیٹوں کیا میں یہاں، اور تو لٹائے کیا

شعورِ درد ہے، سرمایۂ تپیدنِ جاں
جو گھر میں آگ نہ رکھے، دیا جلائے کیا

قدم قدم پہ، تقاضائے عصر کی ٹھوکر
یہ راہ طے ہو، تو کیا جانے موڑ آئے کیا

گرفتِ ذہن سے باہر ہے، وقت کا موضوع
ہمارے بعد، کوئی اب قلم اٹھائے کیا

فضا یہ زہر ہوا، انگبینِ جاں تجھ سے
[illegible] بنائے کیا

ہم نے دیکھا نہ تھا موسم کوئی ایسا سرسبز
دل ہوا خوں تو ہوئی کشتِ تمنا سرسبز

دھیان سے، اس نے سنیں آج، ہماری باتیں
اک زمانے پہ ہوا، حرفِ تقاضا سرسبز

کیا کہوں تم سے کہ یاد آئے ہیں چہرے کیا کیا
عکس در عکس رہا آئنہ اپنا سرسبز

کون سی پیاس میں جلتا ہے، کوئی کیا جانے
موج در موج ہے، پھر بھی نہیں دریا سرسبز

ہر حقیقت ہے سلگتے ہوئے خوابوں کی طرح
آج تک ہو نہ سکا دیدۂ بینا سرسبز

چاہیئے عرضِ ہنر کا بھی سلیقہ یارو!
لفظ سرسبز نہ اسلوب، نہ معنی سرسبز

سوزِ احساس و بصیرت ہے بڑے کام کی چیز
شمع تو بجھ گئی، پھر بھی رہا شعلا سرسبز

دے اب اوروں کو بھی یہ نیلمیں پیکر یارب!
میں ہی کیوں زہرِ سخن سے رہوں تنہا سرسبز

یہ الگ بات، کہ بے ذوق ہوں یوسف کی طرح
میری راتوں میں ہوا خوابِ زلیخا سرسبز

❋

خال و خط کے ورق، لمحۂ رفتہ، کب کا، چرا لے گیا

○

کیا خبر، نظر ان کی جا کے ٹھہر جاتی ہے، کس بلیغ نکتے پر
محفلوں کے دانشور، چونک چونک اٹھتے ہیں میرے سادہ فقرے پر

ذوقِ مصلحت بینی، ان کی ہر شریعت کا، مطمحِ نظر ٹھہرا
وقت کے یہ پیغمبر، طنز بن گئے آخر، اپنے ہی صحیفے پر

پھر نہ اس اندھیرے میں، راہرو معانی کے، راستہ بھٹک جائیں
اے قمر جبیں لفظو! کوئی شمع تو رکھ دو، ذہن کے دریچے پر

سامنے مسائل کے کتنے محشرستاں ہیں، رُت ابھی کہاں بدلی
پھول سا بدن لے کر، لوگ اب بھی رہتے ہیں، آگ کے جزیرے پر

تو نے ذہن تو بخشا، کھول دے ذرا مجھ پر، سوچنے کی راہیں بھی
کتنا بوجھ ہے یارب! مسلکِ طریقت کا، ناتواں عقیدے پر

بندرہ کے خوابوں میں کب تلک حقائق سے. ہم چرائیں گے آنکھیں
آئنہ بتادے گا، کس قدر خراشیں ہیں' تیرے میرے چہرے پر

ہاتھ میں سیاست کے، تیشہ دے دیا کس نے. کوہکن پشیماں ہیں
یہ کمال تو دیکھو! توڑتے ہیں ہم پتھر. رکھ کر آب گینے پر

موجۂ تلاطم کے، چکروں میں کیا پڑتے. ہم تو وہ شناور ہیں
جو عبور کرتے ہیں ریت کے سمندر کو، بیٹھ کر سفینے پر

جو بلند منصب ہیں، شہرت و بصیرت تو صرف ان کا ورثہ ہے
ہم زمین پر رہ کر، پاؤں کس طرح رکھتے. آسماں کے زینے پر

ہم بھی جب تک جیے سرسبز ہی سرسبز رہے
وقت نے زہر اتارا تھا، بدن میں ایسا

بہ سوئے سنگِ خرد، تم اُچھالتے مجھ کو
قلم سہی، کسی تیشے میں ڈھالتے مجھ کو

جو خشک ریت کا صحرا سمجھ رہے تھے مجھے
سمندروں کی طرح، کیوں کھنگالتے مجھ کو

نہ اپنے کاکُل و دامن، سنبھل سکے جن سے
وہ نرم ہاتھ، بھلا کیا سنبھالتے مجھ کو

ذرا سا تلخ سہی، قطرۂ بصیرت ہوں
یہی سمجھ کے، وہ آنکھوں میں ڈالتے مجھ کو

نصا! نہ تھا کوئی افعی تو میں، مثالِ حریف
وہ آستین میں کیوں اپنی، پالتے مجھ کو

○

لے گیا قوتِ تحریر، قلم چھوڑ گیا
ہم ہیں، وہ اپنی بصیرت کا بھرم چھوڑ گیا

غیرتِ فن کا تقاضا تھا بہت جاں آشوب
کیا قلندر تھا، کہ تاج اور حشم چھوڑ گیا

پس روؤں کے لئے کچھ زادِ سفر اور سہی
اپنے پیچھے، وہ مرے نقشِ قدم چھوڑ گیا

اب کہیں امن و تحفظ کی ضمانت ہی نہیں
وہ کبوتر بھی، در و بامِ حرم چھوڑ گیا

حلق بھی تر نہ ہوا، پیاس بھلا کیا بجھتی
چند قطرے ہیں، جنھیں ابرِ کرم چھوڑ گیا

اُس کو کیا فکر، اب اولے گریں، پتھر برسیں
وہ ہمیں لا کے، سرِ شہرِ ستم، چھوڑ گیا

عبد و معبود کا رشتہ بھی ہے نازک کتنا
میری بستی میں، وہ شیشے کے صنم چھوڑ گیا

کم نہیں بانکپن اتنا بھی، غزل کے مطرب!
لے کا شعلہ، خسِ آواز میں خم چھوڑ گیا

ذہن اور سوچ تو پابند ہیں، لکھوں کیونکر
مجھ کو کس وادیِ حسرت میں قلم چھوڑ گیا

میرے بعد اس سے، معافی کی نئی فصل اُگی
میں خیالات کی مٹی میں وہ نم چھوڑ گیا

قتل میرا، لمحۂ خنجر بہ کف! آساں نہ تھا
تو بنا لیتا مجھے اپنا ہدف، آساں نہ تھا

راستے، بے سمتیوں کی بھیڑ میں گم ہو گئے
لوٹنا اس حال میں، اپنی طرف آساں نہ تھا

ہے اسی کی ذات کا اثبات، اپنی ذات بھی
یعنی، گوہر کا تشخص بے صدف آساں نہ تھا

میں گزرتے وقت کا اک لمحۂ موجود ہوں
روک رکھنا مجھ کو ماضی کی طرف آساں نہ تھا

نظمِ معنی نے کیا ہے اے فضا اس کو درست
ٹوٹتی کیوں کر، مرے لفظوں کی صف آساں نہ تھا

خدا کسی کو، نہ یہ کربِ نارسائی دے
ہوں وہ صدا، جو نہ اُس کو کبھی سنائی دے

کبھی زمیں ہی نہ تھی جیسے، پاؤں کے نیچے
نظر اٹھاؤں تو، بس آسماں دکھائی دے

بجھا سکوں تو ذرا، پیاس اپنے کانٹوں کی
دیئے ہیں پاؤں تو، ذوقِ برہنہ پائی دے

اٹھاؤں اپنی شبوں سے، ندامتیں کتنی
چراغ مجھ کو بنایا، تو روشنائی دے

ترے ہی ہاتھوں، مجھے شہرتوں کے داغ لگے
سیاہ چہرہ قلم! اب نہ یوں صفائی دے

قضا تم اُس کو مسیحائے زندگی سمجھو!
وہ اپنے ہاتھوں، جسے زہرِ آشنائی دے

فضا ابن فیضی کے تخلیقی سفر کی

منزلیں

سفینۂ زرِ گل	⁘	غزلیات و رباعیات	⁘	مطبوعہ
شعلۂ نیم سوز	⁘	منظومات	⁘	مطبوعہ
دریچۂ سیم سمن	⁘	غزلیات	⁘	مطبوعہ
پسِ دیوارِ حرف	⁘	غزلیات	⁘	زیرِ کتابت
سرِ شاخِ طوبیٰ	⁘	منظومات	⁘	زیرِ کتابت
غزالِ مشک گزیدہ	⁘	رباعیات	⁘	زیرِ ترتیب

فیضی پبلیکیشنز۔ مئوناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱ (یوپی)

